

قرآن کا مطلوب انسان

مولانا وحید الدین خاں

WWW.IRCPK.COM

مطبوعات اسلامی مرکز

قرآن کا مطلوب انسان

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

ISBN 81-85063-48-6

مطبوعات اسلامی مرکز

جملہ حقوق محفوظ

ناشر: مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نی دہلی ۱۱۰۰۱۳

اشاعت اول ۱۹۷۹

اشاعت دوم ۱۹۸۲

اشاعت سوم ۱۹۸۶

مطبوعہ: جیت پریس، دہلی ۶

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

*** توجہ فرمائیں! ***

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب.....

✎ عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں

✎ مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں

✎ متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں

✎ دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے

*** تنبیہ ***

✎ کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب کسی بھی الیکٹرانک کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے

✎ ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com

MAKTABA AL - RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N.Y. 11230
TEL: (718) 258-3435

فہرست

۲	صفحہ	آغاز
۳		اسلام ایک عظیم جدوجہد
۱۹		قرآن کا مطلوب انسان
۳۰		مومن کی تصویر
۴۱		بامقصد زندگی
۴۸		یہ بے حسی کیوں
۶۰		دعوت اسلامی کے کارکنوں کی ذمہ داریاں
۶۲		کوئی سننے والا ہے جو سنے
۷۰		خدمت دین کی مشکلات
۷۶		ہمیں کیا کرنا ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زیر نظر مجموعہ راقم الحروف کی چند تقریریں پر مشتمل ہے۔ یہ تقریریں جماعت اسلامی ہند کے مختلف اجتماعات میں ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک پیش کی گئی تھیں اور اس کے بعد اسی زمانہ میں اکثر ماہنامہ زندگی (رام پور) اور بعض ماہنامہ الفرقان (کھنڈو) میں شائع ہوئیں۔ ان رسائل کے صفحات سے لے کر انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ان مختلف تقریریں کو جو چیز ایک کتاب کا مشترک حصہ بناتی ہے، وہ ان کا مشترک موضوع ہے۔ یہ ہے: اسلام کی حقیقت کو واضح کرنا، اور اس کی خدمت و اشاعت کا جذبہ دلوں میں ابھارنا۔

آدمی فطرت سے کچھ صلاحیتیں لے کر آتا ہے۔ مثلاً کوئی فیاض ہوتا ہے کوئی شیریں بیان۔ کوئی خیال ہوتا ہے کوئی حوصلہ مند۔ یہ ”انسان“ وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں جس انسان کی قیمت ہے وہ یہ نہیں ہے۔ اللہ کے یہاں قیمت رکھنے والا ”انسان“ وہ ہے جو آدمی کے خود اپنے ارادہ سے ابھرتا ہے۔ آدمی اپنے شعوری عمل، بالفاظ دیگر خدائی محرک کے تحت اپنے کو جیسا بناتا ہے اسی کے مطابق وہ اللہ کے یہاں درجہ حاصل کرتا ہے۔

انسان بظاہر بہت سے اعضاء و جوارح اور بے شمار بالوں اور ناخنوں کا مجموعہ ہے۔ مگر حقیقتاً انسان ایک لطیف وحدت کا نام ہے۔ اس وحدت کی سطح پر جب کسی فکر کا غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ اس کے وجود کے تمام حصوں میں ظاہر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دین کا بھی ہے۔ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، کسی مجموعہ قوانین کا نام نہیں، وہ ایک قلبی حالت کا نام ہے۔ قلب انسانی میں جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے تو پوری زندگی اس کے رنگ میں رنگی چلی جاتی ہے۔ خواہ ”نماز روزہ“ کا معاملہ ہو یا اسلامی دعوت کا، راہ سے کاٹنا ہٹانے کا عمل ہو یا میدان جنگ میں جہاد کرنے کا، سب کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی کے اندر وہ مومنانہ روح پیدا ہو جو آدمی کو اللہ سے قریب کرتی ہے اور اس کے اندر وہ اعلیٰ خصوصیات پیدا کرتی ہے جو اس کو حقیقی دنیا کا شہری بنانے والی ہیں۔ یہی اندر کا ”مومن“ وجود میں آنا تمام اعمال کا اصل مقصد ہے۔ زیر نظر مجموعہ کے مضامین میں، مختلف انداز سے، یہی حقیقت ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ یہ سب اجتماعی خطابات ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ان کا انداز تقریری ہے نہ کہ تصنیفی۔

کئی صورت میں شائع کرتے ہوئے راقم الحروف نے ان مضامین پر نظر ثانی کی ہے۔ تاہم یہ نظر ثانی صرف جزئی یا فظی تبدیلیوں کی حد تک ہے۔ اصل مضمون میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ مضامین تقریباً اپنی اصل ابتدائی صورت ہی میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ ایسا زیادہ تر اس جذبہ کے تحت کیا گیا ہے کہ ان کی تاریخی حیثیت برقرار رہے۔

اسلام۔ ایک عظیم جدوجہد

قرآن مالک کائنات کا فرمان ہے، جو اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ عزت کس کے لیے ہے اور ذلت کس کے لیے۔ کامیاب کون ہے اور نامراد کون۔ دنیوی اعتبار سے جب ہم کامیابی کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی سوسائٹی میں ایک شہری کو ترقی کے جو مواقع دیے گئے ہیں ان کو استعمال کر کے اونچے درجات تک پہنچنا۔ ایک شخص بڑا تاجر، اونچا عہدیدار اور اعلیٰ اعزازات کا مالک ہو تو اس کو کامیاب انسان کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول کے اندر تجارت کو بڑھانے کی جو ممکن صورتیں ہیں، اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کے لیے جو صفات مقرر کی گئی ہیں، اعزازات کے حصول کے لیے جو راستے بنے ہوئے ہیں، وہ شخص ان کو عبور کر گیا ہے اور اپنی جدوجہد کے نتیجے میں اس نے اس بلند مقام کو پایا ہے جو قانون و وقت کے تحت اس کے لیے ممکن تھا۔ کامیابی کے معنی الدین کا چراغ پالنے کے نہیں ہیں، بلکہ کامیابی اس واقعہ کا نام ہے کہ ایک شخص نے اپنی صلاحیت اور کام کے مواقع کو ان راہوں میں صرف کیا جو اس کے لیے کھلی ہوئی تھیں اور بالآخر اپنی کوششوں کے نتیجے میں اس منزل تک پہنچ گیا جہاں ان راستوں کا کوئی ٹپنے والا پہنچتا ہے۔ کامیابی کوئی خوش قسمتی سے پیش آنے والا اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ وہ صحیح جدوجہد کا فطری نتیجہ ہے۔ یہی بات کو ایک مفکر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:-

”لائق شخص اور کامیاب نہ ہو، یہ تھوٹ ہے“

یہی حال دوسری زندگی کی کامیابی کا بھی ہے جو انسان کی حقیقی منزل ہے جہاں تمام اگلے پھیلے انسان اپنے رب کے حضور جمع کیے جائیں گے۔ اس دن عزت اور کامیابی ان لوگوں کے لیے ہوگی جو خدا کی رضا کو پالیں اور ذلت اور نامرادی ان کے لیے جو اس کی رضا کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ پہلے گروہ کے لیے دائمی عیش ہے اور دوسرے گروہ کے لیے دائمی عذاب۔ جو شخص قرآن پر ایمان لائے اور اسلام کو اختیار کرے وہ گویا پہلے انجام کا امیدوار ہے اور دوسرے انجام سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر اس مقام بلند کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم چڑھائی ہے جس کو عبور کرنے کے لیے عمل کے بعد آدمی اس کے اوپر پہنچتا ہے۔ خدا کا انعام کسی پٹری ہوئی چیز کی طرح محض اتفاق سے کسی کو نہیں مل جاتا، بلکہ دنیوی کامیابی کی طرح وہ ایک زبردست جدوجہد کا قدرتی نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق کسی شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ آخرت میں انسان کی کامیابی دراصل ایک لمبے امتحان سے پار تر جانے کا دوسرا نام ہے۔ انسان کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی دنیاں ڈال دی ہے جہاں طرح طرح کے باطل نظریات اور فاسد رجحانات ہیں جن سے اسے اپنے دل و دماغ کو پاک کرنا ہے۔ بہت سے غلط اور ناجائز طریقے ہیں جن سے اسے بچنا ہے۔ بہت سی شیطانی اور طاغوتی قوتیں ہیں جو انسان کو راہ حق سے پھیرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ ان طاقتوں سے

لڑتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا ہے غرض دشواریوں سے بھرا ہوا ایک راستہ ہے جس کو طے کر کے اس کو اپنے رب تک پہنچنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

مُحِبَّتِ النَّاسِ بِالشَّهَوَاتِ وَمُحِبَّتِ الْجَنَّةِ بِالْمُكَارِبِ (متفق علیہ) - جنہم لذوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور جنبتِ کلمینوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

اسلام کی حقیقت کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو اس کے لیے "قربانی" سے زیادہ موزوں اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔ اسلام دراصل ایک زبردست جدوجہد ہے وہ قربانی کا ایک مسلسل عمل ہے جو ایمان لانے کے بعد سے آدمی کی موت تک جاری رہتا ہے سب سے پہلی قربانی آدمی اس وقت دیتا ہے جب وہ اپنے پسندیدہ خیالات اور فانی رجحانات کو خیر باد کہہ کر دین حق کو قبول کرتا ہے، اس کے بعد دوسری قربانی وہ ہے جو اس کی دنیا میں دی جاتی ہے۔ اخلاق و معاملات اور معیشت و تمدن میں وہ ان طریقوں کو چھوڑ دیتا ہے جو خدا کو ناپسند ہیں اور ان طریقوں کو اختیار کر لیتا ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ پھر جب وہ ان دونوں مرحلوں کو پار کر لیتا ہے تو وہ امتحان کے اس آخری میدان میں پہنچ جاتا ہے جہاں نہ صرف حرام چیزیں بلکہ زندگی کے جائز اثاثے بھی چھوڑ دینے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کر دینی پڑتی ہے۔ یہ جان کی قربانی اس سلسلہ امتحان کی تکمیل ہے اور عہدِ بندگی کو آخری طور پر ثبات کر دکھانا ہے جو ایمان لا کر آدمی نے اپنے رب سے کیا تھا۔ یہ تین دورِ حین سے گزر کر آدمی اپنے رب تک پہنچتا ہے اور اس کی رضا کا متحق بنتا ہے، ان کو قرآن میں - ایمان - ہجرت اور جہاد - کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَكْبَرُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (توبہ - ۲۰)

جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور مالوں سے خدا کی راہ میں جہاد کیا ان کے لیے خدا کے یہاں بڑا درجہ ہے اور وہی لوگ دراصل کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس آیت میں ایمان سے مراد ان حقائق کو تسلیم کرنا ہے جو قرآن میں یقین کیے گئے ہیں، اور ہجرت سے مراد اس اعتراف اور اس کے تقاضوں کے خلاف جو کچھ ہے اس کو چھوڑ دینا اور جہاد اس کو نشاں اور جدوجہد کا نام ہے جو ایمان اور مہاجرت کی زندگی کو آخری حد تک لائی رکھنے کے لیے اس دنیا میں آدمی کرتا ہے۔ اس طرح یہ ایمان، ہجرت اور جہاد - ایک دوسرے سے الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلہ سفر کی اگلی پچھلی منزلیں ہیں۔ یہ ایک ہی کیفیت کے مختلف ارتقائی مراحل ہیں جن کو میسر کرنے کے لیے جدا جدا عنوان دے دیا گیا ہے۔ نیز ہجرت اور جہاد کی کوئی متعین صورتیں نہیں ہیں۔ ایمان کی حقیقت، مختلف حالات میں، مختلف صورتوں میں ظہور کرتی ہے۔ کسی کے لیے ہجرت ترک وطن کے ہم سہی ہوتی ہے، کسی کے لیے صرف یہ کہ وہ اپنے ائمہ کے برے رجحانات کو چھوڑ دے۔ کسی کا جہاد اس کو برائی قوتوں سے ٹکرا کر نکلے جانا

ہے کسی کا جہاد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی داخلی ترغیبات کا مقابلہ کر کے اس کو زیر کرے۔

ایمان

سب سے پہلے ایمان کو لیجیے یہ اس عظیم امتحانی مہم میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا ہے جس کی ابتدا زبان کے اقرار سے ہوتی ہے اور جس کی انتہا یہ ہے کہ اسی پر قائم رہتے ہوئے آدمی اپنی جان دے لے۔ یہ وہ عہد ہے جو بندہ اپنے خدا سے اس بات کے لیے کرتا ہے کہ وہ ساری عمر اس کا وفادار رہے گا۔ ایمان اس کیفیت کا نام ہے جو حقیقت کے صحیح اور مخلصانہ شعور سے پیدا ہوتی ہے جب آدمی اس حیرت انگیز کائنات کے پیچھے ایک لامحدود قوت کا مشاہدہ کر لیتا ہے جب وہ خدا کے رسول کو تسلیم کر کے اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جاتا ہے، جب اس کا دل یکساں ہوتا ہے کہ تخلیق کا عظیم منصوبہ بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب ماضی اور تخیل کے تمام انسانوں کو جمع کر کے ان کا حساب لیا جائے، تو اسی کیفیت کے مجموعہ کو ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایمان کی اصل روح اعتماد کرنا ہے۔ یہ اعتماد ایک ایسی ہستی کے بارے میں ہوتا ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے اس میں یقین کا فہم پیدا ہوا۔ اسی طرح خدا کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننے کے لازم معنی یہ ہیں کہ اس کے غضب سے ڈرا جائے اور اس کے عذاب سے بچنے کی فکر کی جائے اس لیے اس کے ساتھ تقویٰ اور خوف کا ہوا ضروری ہے۔ اس طرح اگر قرآن کے تصور ایمان کی تشریح کے لیے تین الفاظ - یقین، اعتماد اور خوف - کو اکٹھا کر دیں تو ہم اس کی روح کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ایمان اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خدا اور اس کے رسول پر اس کی اعتماد کا نام ہے جو یقین کامل سے پیدا ہوتا ہے اور خدا سے اس خوف کا نام ہے جو آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ کسی پوٹیس اور فوج کے تسلط کے بغیر خود سے اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لے۔

یقین جو ایمان کا پہلا جزو ہے، یہ خارج سے درآمد کی ہوئی کسی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا زندہ شعور ہے جو خود انسان کی فطرت میں بھی ہوئی ہے۔ انسان کائنات پر غور کرتا ہے۔ رسول کی نیلماں کو دیکھتا ہے اور اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز پر کان لگاتا ہے تو یہ نینوں چیریں بالکل ایک معلوم ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ایک ہی پیغام ہے جو ایک وقت میں تین مختلف مقامات سے نشر ہو رہا ہے۔ خدا کا رسول جس حقیقت کی خبر دیتا ہے کائنات پوری کی پوری بالکل اس کی ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے اور انسان کی اندرونی آواز بہر تن اس کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کتاب الہی میں جو کچھ پڑھتا ہے زمین و آسمان کے اندر اسی کو دیکھتا ہے اور جو کچھ پڑھتا ہے اس کی فطرت اس کو اس طرح بتول کر دیتی ہے جیسے کسی خانے میں بالکل اسی سائز کی چیز رکھ دی گئی ہو۔ مگر یقین کی یہ کیفیت کسی کو خود بخود حاصل نہیں ہوتی۔ جس طرح فطرت کی ہر صلاحیت اسی وقت رد ہوتا آتی ہے جب اس کو نشوونما دے کر

ابھارا جائے، کائنات کا ہر راز اسی وقت انسان کے اوپر بے نقاب ہوتا ہے جب اس کی تلاش میں وہ اپنے آپ کو کم کر چکا ہو۔ اور کسی کتاب کے مضامین اسی وقت آدمی پر کھلتے ہیں اور اسے فائدہ پہنچاتے ہیں جب اس کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے مطالب کو افاد کیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح یہ یقین بھی آدمی کو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنی قوت ارادی کو اس کے لیے کام میں لائے۔ یہ اگرچہ کائنات کی واضح ترین حقیقت ہے مگر اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ آدمی کو وہی کچھ ملے جس کے لیے اس نے جدوجہد کی ہو۔

ایمان کا دوسرا جز اعتماد ہے۔ اپنی ذات اور کائنات کا مطالعہ جہاں آدمی کو ایک طرف یہ بتاتا ہے کہ ایک عظیم خالق اور کارساز ہے جو اس کا رخانے کے تمام واقعات کا حقیقی سبب ہے۔ اسی کے ساتھ اور عین اسی وقت اس کو دو اور باتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک اپنی انتہائی بے چارگی کا اور دوسرے خدا کے بے پایاں احسانات کا۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے بے شمار چیزوں کا ضرور مؤثر ہے۔ مگر وہ کسی ایک چیز کو بھی خود سے نہیں بنا سکتا۔ وہ ایک کمزور بچہ کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی زمین کے اوپر کھڑا ہے جو فضا کے اندر معلق ہے جس کے توازن میں معمولی بگاڑ بھی آجائے تو اس کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہے، وہ اپنے کو ایک اعلیٰ عظیم کائنات کے اندر گھرا ہوا پاتا ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ ان حالات میں اس کو اپنا وجود بالکل بے بس اور حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ وہ سب کچھ جس کی اسے ضرورت تھی، اس کے لیے مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس کو ایسا جم دیا گیا ہے جو دیکھنا ہے، جو سنتا ہے، جو بولتا ہے، جو سوچتا ہے اور اس کی قوتوں کو برقرار رکھنے کے لیے ایک خود بخود چلنے والی مشین کی طرح مسلسل کام کر رہا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ زمین و آسمان کی ساری قوتیں پوری ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کو اپنا وجود عظیم احسان نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ جذبہ شکر اٹھتا ہے اور وہ احسان مندی کے جذبہ سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ اس ہستی کو اپنا سب کچھ قرار دے جس نے یہ سارا انتظام اس کے لیے کیا ہے۔ پہلی چیز اس کو اپنی مکمل بے بسی کا یقین دلاتی ہے اس کو شدید احساس ہوتا ہے کہ کوئی بلند تر قوت ہو جو اس کی دیکھیری کرے۔ اور دوسرا احساس اس کی اس طلب کا جواب بن کر سامنے آتا ہے۔ جو مطالعہ اس کو اپنے اندر ظاہر کا احساس دلاتا ہے وہی مطالعہ بیک وقت اس خلا کو پر بھی کر دیتا ہے۔

ایمان کا تیسرا جز ”خوف“ ہے۔ یہ خوف ایمان کے ابتدائی دو اجزاء۔ یقین اور اعتماد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ اور اس کی تکمیل ہے۔ ایک طرف وہ خدا کو دیکھتا ہے جو عدل و حکمت کا خزانہ ہے۔ دوسری طرف کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کا دل پکاراٹھکتا ہے کہ اتنا بڑا تخلیقی منصوبہ بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ پھر جب وہ زمین پر رہنے والے انسانوں کو دیکھتا ہے جن میں ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی۔ اچھے

بھی ہیں اور برے بھی، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ محاسبہ کا ایک دن آنا ضروری ہے جہاں بچوں کو ان کی کجائی کا اور بڑوں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے۔ رب العالمین پر اعتماد ہی اس کے لیے رب العالمین سے خوف کی بنیاد بن جاتا ہے۔

یہ خدا کا خوف اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو کسی ڈراؤنی چیز کو دیکھ کر آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو کسی بھی ایک لفظ سے صحیح طور پر تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انتہائی امیدوار انتہائی اندیشہ کی ایک ایسی ٹلی جلی کیفیت ہے جس میں بندہ کبھی یہ طے نہیں کر پاتا کہ دونوں میں سے کس کو فوقیت دے۔ یہ سب کچھ کر کے اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کا وہ اعلیٰ ترین احساس ہے جس میں آدمی کو صرف اپنی ذمہ داریاں یاد رہتی ہیں اور اپنے حقوق کو وہ بالکل بھول جاتا ہے۔ یہ محبت اور خوف کا ایک ایسا مقام ہے جس میں آدمی جس سے ڈرتا ہے اسی کی طرف بھاگتا ہے، جس سے چھینے کا خطرہ محسوس کرتا ہے اسی سے پانے کی بھی امید رکھتا ہے یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو سراپا اطمینان ہے اور ایسا اطمینان ہے جو سراپا اضطراب ہے۔

یہ ایمان کے تین نمایاں پہلو ہیں۔ ایمان دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو خدا کے خوف، اس پر مکمل اعتماد اور اس کے بارہ میں کامل یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسولوں پر اور اس کے احکام پر ایمان لائے، انہیں سب کچھ اس کو سونپ دے، اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مومن ہے۔ ایمان عقل کے لیے ہریت اور روشنی ہے اور دل کے لیے طہارت اور پاکیزگی۔ اس لیے عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور خیالات و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ قرآن کی زبان میں مومن وہ شخص ہے جو خدا کا خالص اور وفادار بندہ ہے اور اس کے احکام پر یقین و اعتماد کی ساری کیفیات کے ساتھ اطاعت کا معاہدہ کرتا ہے۔

ہجرت

اب ہجرت کو لیجیے۔ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا، ترک تعلق کرنا، عام طور پر ہجرت کو ترک وطن کے معنی سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً ہجرت کا لفظ مخصوص طور پر جس واقعہ کے لیے بولا جاتا ہے وہ یہی ہے مگر کسی واقعہ کو اس کے پس منظر سے الگ کر کے سمجھا نہیں جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترک وطن جو مومن کی زندگی میں پیش آتا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا بلکہ ایک لمبی تاریخ کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مومن کی زندگی میں پہلے دن سے شروع ہوتا ہے اور بالآخر ترک علاقہ تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک شخص ہر حق کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ اٹھ کر لوگوں کو اس کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے، وہ وقت کے خلاف ایک نئی آواز کا علمبردار بن کر گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے ماحول کی بندگی چھوڑ دی ہے اور زمانہ کے خلاف اپنے لیے ایک راہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے، یہ ہجرت کا آغاز ہے جب

آدمی نامائز زندگی کو چھوڑ کر جائز زندگی کو اپنانے کا عزم کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک سلسلہ جدوجہد شروع ہوجاتی ہے جس میں اس کو بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنا اور بہت سی نئی چیزوں کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ کتنے ہی اپنے لوگوں سے گٹنا اور کتنے ہی غیر لوں سے جڑنا ہوتا ہے۔ اندر سے باہر تک بے شمار پسندیدہ چیزوں کو ترک کرنا اور اس کے بجائے دوسری ناخوش گوار چیزوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ایمان لانے کے ساتھ ہی مومن کی زندگی میں ہجرت۔ ایک نیا طرز عمل اختیار کرنے کے لیے بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنے کی ابتدا ہوجاتی ہے۔ یہ ہجرت جو اس نے خود کی ہے دوسروں کو بھی اسی کی طرف بلانا شروع کردیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کچھ لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ مخالف بن جاتے ہیں۔ اس طرح ماحول میں دو بالکل مقابل گروہ ابھرنے لگتے ہیں جن میں سے ایک گروہ اس چیز سے جڑا ہوا رہتا ہے جس کو دوسرا گروہ چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ یہ اختلاف صرف اس پہلو سے نہیں ہوتا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر تنقید کرتا ہے اور اس کے رد پر کو غلط قرار دیتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دونوں کے درمیان ایک علی کش کش شروع ہوجاتی ہے انسانی معاشرہ ایک وحدت ہے جس میں کوئی شخص دوسرے تمام لوگوں سے الگ اپنے لیے کوئی راہ نہیں بنا سکتا۔ انسان اپنی عین فطرت کے اعتبار سے سماجی واقع ہوا ہے۔ اس کی تمام ضرورتیں دوسروں سے مل جل کر انجام پاتی ہیں اور اس کو دوسروں کے پھیلائے ہوئے نظریات کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اپنے پسند کیے ہوئے نظریہ کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ سماج کے تمام اداروں میں اسی نظریہ کو رائج نہ کر لے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ مدرسہ میں اپنی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتا نہ بازار میں اپنی مرضی کے مطابق خرید و فروخت کر سکتا۔ دعدالتوں سے اپنے اصول کے مطابق فیصلے لے سکتا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتا کہ جس چیز کو وہ حلال سمجھتا ہے اسے کھائے اور جو چیزیں اس کے نزدیک حرام ہیں ان کو اپنے حلق کے نیچے اترنے دے۔ اس لیے جب کوئی شخص وقت کے خلاف کسی مسلک کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ لازمی طور پر ان لوگوں سے ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے جن کے بنائے ہوئے نظام کے اندر وہ زندگی گزار رہا ہے۔ انسانی معاشرہ کی مثال ایک جال کی سی ہے جس کے تمام افراد جھٹوں کی مانند ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک حلقہ کو الگ کرنے کی کوشش پورے جال کو جھجھوڑ دیتی ہے۔ اس طرح ایک مستقل اختلاف شروع ہوجاتا ہے جو دن بہ دن نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ قدم قدم پر ایک دوسرے سے مزاحمت پیش آتی ہے۔ جس میں برسر اقتدار طبقہ اہل حق کو تسانے اور ان کو ذرائع حیات سے محروم کرنے کی ساری تدبیریں کرتا ہے۔ دونوں طرف سے شدت بڑھتی چلی جاتی ہے ایک طرف مظالم کی شدت۔ دوسری طرف یہ شدت کہ سب کچھ ہمیں گے مگر اپنے عزم کو ترک نہیں کریں گے۔ جس چیز کو غلط سمجھ کر ایک بار چھوڑ چکے ہیں اس کی طرف دوبارہ واپس نہیں جائیں گے۔ کیش کش بالآخر ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتی ہے جہاں معاشرہ حق پسندوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ فیصلہ

کرتا ہے کہ ان کے وجود کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ اس وقت اہل حق یہ طے کرتے ہیں کہ اس سببی کو چھوڑ کر زمین کے کسی دوسرے ٹکڑے میں چلے جائیں۔ پہلے انھوں نے غلط خیالات اور حرام معاملات کو ترک کیا تھا۔ اب وہ اپنے مکان، اپنی جائیداد اپنے عزیزوں، غرض ساری مادی حیات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ہجرت کی آخری اور انتہائی شکل ہے۔

اس ہجرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک مقام کو چھوڑ کر آدمی دوسرے مقام پر چلا گیا، بلکہ باطن کو چھوڑ کر حق کی طرف بڑھنا ہے۔ یہ شیطان اور طغوت کی بندشوں سے نکل کر خدا کی طرف بھاگنا ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں مؤمنین کی ہجرت کو "ہجرت الی اللہ" کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی طرف ہجرت۔ ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ زمین کو چھوڑ کر آسمان پر نہیں چلے جاتے بلکہ اسی دنیا میں رہتے ہیں، اب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ چھوڑنے کا عمل خدا پرستی کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ خدا کی طرف ہجرت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جو کچھ مانع آئے، جو چیز بھی اس کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بنے اس کو چھوڑ دینا۔ یہ خدا پرستانہ زندگی کی بنیاد ہے جب تک آدمی اس ہجرت کے لیے تیار نہ ہو وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو اس قربانی کے لیے تیار ہو جب وہ دیکھے کہ اس کے اندر ایسے انکار اور رجحانات پرورش پا رہے ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں تو انھیں کھرچ کر نکال دے۔ اگر وہ غلط اعمال میں مبتلا ہو تو انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ کسی کا تعلق دین کی طرف کھل کر کرنے میں رک بن رہا ہو تو ایسے تعلق کو خیر باد کہہ دے کسی معیار زندگی کو برقرار رکھنے کا مسئلہ دین کے کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کا موقع نہ دیتا ہو تو ایسے معیار زندگی کو دفن کر دے۔ دین کے تقاضے پورے کرنے میں ممانعتی خوشحالی کو خطرو لاحق ہو تو اس کو گوارا کر لے۔ اپنے آپ کو خدمت دین کے لیے وقف کرنے میں اپنا اور بچوں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہو تو اس کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ جائے۔ غرض ہر بار جب آدمی کسی ایسی حالت میں مبتلا ہو کہ ایک طرف خدا بلارہا ہو اور دوسری طرف کوئی دوسرا تقاضا آدمی کو کھینچ رہا ہو تو دوسرے تقاضوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھ جانا۔ اسی کا نام ہجرت الی اللہ ہے۔

اس ہجرت کے بہت سے مراحل اور اس کی بے شمار قسمیں ہیں مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہم اس کو دو بڑے عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک ناجائز اور حرام چیزوں کو چھوڑنا اور دوسرے ان چیزوں کو چھوڑنا جو فی نفسہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ مگر دین کو اختیار کرنے کے نتیجے میں ایسے مراحل آتے ہیں کہ دین کو ان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

ہجرت کی پہلی قسم میں خیالات اور اعمال کی وہ پوری فہرست آتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام اور قابل ترک قرار دیا ہے ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے ماحول نام ہے تاریخ، روایات، عادات اور جال ملین کے ایک مخصوص ڈھانچہ کا۔ یہ انکار و اعمال کا ایک نظام ہے جو زندگی کے تمام گوشوں پر چھایا ہوا

رہتا ہے جس طرح زمین کے گوشے کے گرد ہوا کا ایک غیر مرئی غلاف ہے جس میں ہم سب لوگ ڈوبے ہوئے ہیں۔ تھیک اسی طرح ہر سیلاب ہونے والا اپنے وقت کے ماحول میں ڈوبا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے اندر اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ ماحول کے انکار اور روایات اس کی رگ رگ میں پیوست ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات ان کے خلاف سوچنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے جب آدمی پر حق کا احساس ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس دین آباء کو چھوڑنے کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ اس کو ان تمام غلط اثرات کو کھرچ کر اپنے اندر سے نکال دینا ہوتا ہے جو ماحول کے اثر سے اس نے قبول کر رکھے تھے۔ پھر ہر آدمی کے اندر ایک نفس ہوتا ہے، یہ نفس ہر لذتوں کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط، اچھی ہے یا بری۔ بلکہ اس کے نزدیک پسندیدگی کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے اور اس کے ذریعے سے اس کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آدمی اپنی جاہلی زندگی میں بہت سی ایسی چیزیں اور مشغولیتوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے جو اگرچہ غلط ہیں مگر اس کے نفس کو پسند آتے ہیں۔ اسی طرح وہ بہت سی ایسی ذمہ داریوں کو بھلا دیتا ہے اور انھیں ترک کر دیتا ہے جو اگرچہ اخلاقاً اس کے لیے ضروری ہیں، مگر اس کے نفس کو پسند نہیں آتیں۔ اس لیے جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو اس کو اپنی زندگی میں شکست و ریخت کا ایک مستقل عمل جاری کرنا پڑتا ہے، بہت سی چیزیں جو اس کو کھلی زندگی میں نہایت عزیز تھیں انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اور بہت سی چیزیں جن سے اسے نفرت تھی جن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان کو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہوتا ہے، اس طرح ایمان لانے کے بعد غلط جذبات، غلط تعلقات، اور غلط اعمال سے جدائی کی ایک مستقل ہم شروع ہو جاتی ہے زندگی کے تمام معاملات میں ناجائز طریقوں سے بچنے کا ایک ہم عمل کرنا ہوتا ہے جو موت کی آخری گھڑی تک جاری رہتا ہے یہ ہجرت کی پہلی اور ابتدائی قسم ہے جو ماضی کے غلط عادات و اطوار سے اپنے کو پاک کرنے اور آئندہ اس طرح کی کوئی چیز قبول نہ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ہجرت کا ذکر قرآن میں سورہ مدثر میں کیا گیا ہے جو نبوت کے باطل ابتدائی زمانے کی سرور ہے۔ فرمایا

وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِهَتِهِمْ تَارِبُونَ (مدثر - ۵)

گندگی سے ہجرت کر رہے تھے اپنی خیالی اور عمل کی تمام باتوں کو چھوڑ کر

یہی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منذر جب ذیل الفاظ میں واضح فرمائی ہے۔

أَلَمْ يَأْتِ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ فَأَمَّا اللَّهُ فَعَنَّمْ - مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔

یہ ہجرت الی اللہ کا ایک پہلو ہے جس میں آدمی کو تمام ناجائز چیزیں چھوڑ دینی ہوتی ہیں۔ خدا کی مرضی

کے مطابق بننے کے لیے ان چیزوں سے اپنے کو پاک کرنا ہوتا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس میں آدمی مجبور ہوتا ہے کہ اپنے جائز مفادات بھی خدا کی راہ میں قربان کر دے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسلام آدمی کو کرنے کا اتنا بڑا کام دے دیتا ہے کہ اس کے بعد پھر اسے کچھ اور کرنے کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اس کی توجہات اپنی ذات سے ہٹ کر بہتق اسلام کی طرف لگ جاتی ہیں۔ اسی

ایسے کہا گیا ہے کہ دنیا کے اندر مومن کی صرف ذمہ داریاں ہیں۔ یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے اس کا جو کچھ حق ہے وہ خدا کے یہاں ہے اور وہیں وہ اسے پائے گا۔

اسلام کو قبول کرنے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں اس کو اختیار کر لے، بلکہ مومن ہی کے ساتھ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو اس کی طرف بلائے اور پورے معاشرہ میں اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کرے۔ دین کا یہ دوسرا تقاضا ہماری ذمہ داری کو صرف دگنا نہیں کرتا بلکہ اس کو انتہائی حد تک دشوار بنا دیتا ہے۔ اگرچہ انفرادی زندگی میں ممکن حد تک دین کو اختیار کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ یہ فتنوں سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے اختیار اور اپنے ارادہ کو صرف صحیح سمت میں استعمال کرنا ہے۔ یہ خود غمناک ہو کر اپنی مرضی سے اپنے آپ کو پابند بنالینا ہے اور موت کی آخری گھڑی تک پابند بنائے رکھنا ہے۔ مگر دین کا دوسرا تقاضا — یعنی دوسرے بندگان خدا تک خدا کے پیغام کو پہنچانا اور اس کے دین کو عملاً زمین کے اوپر رائج کرنے کی جدوجہد کرنا۔ یہ اتنا گراں بار تقاضا ہے کہ اس کا تصور بھی آدمی کو لرزادیئے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم اور جال کش کام ہے جو اس کی ساری قوت اور اس کا سب کچھ مانگتا ہے۔ ثبوت حق اور انصاف دین کے علاوہ کسی کام میں وہ قتنا وقت اور قوت بھی صرف کرے گا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی کے بقدر وہ اصل فریضہ کی ادائیگی میں کمی کر رہا ہے۔

آدمی جب اس حیثیت سے دین کو قبول کرتا ہے تو وہ فوراً محسوس کرتا ہے کہ اس کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کے سمنی یہ ہیں کہ میں اور کچھ نہ کروں۔ وہ اپنے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں پاتا کہ اپنی ضرورتوں کو انتہائی حد تک مختصر کر دے۔ دنیا کے اندر اپنی تمناؤں کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دے اور اپنی ذات کے لیے کم سے مصروف رہ کر حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ بالکل ناگزیر ضرورت کی فراہمی کے بعد جو وقت بھی ملے اس کو شہادت دین کی راہ میں لگا دے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کو اپنی انفرادی زندگی میں اختیار کرنا جو تو صرف حرام چیزوں کو چھوڑ کر بھی کوئی شخص دیندار بن سکتا ہے مگر اسلام کو اجتماعی زندگی میں اختیار کرنے کی ہم شہادت دین کی راہ میں لگا دے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کو اپنا پورا حصہ اس کے بغیر صحیح طور پر اس کام کی ابتدا بھی نہیں کی جاسکتی۔ اس کو انجام تک پہنچانا تو بہت دور کی بات ہے۔

پہلی صورت میں آدمی کے اوپر صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے اور دوسری صورت میں وہ ساری خلق تک پیغام حق پہنچانے کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ یہ چیز آپ کی مصروفیتوں اور دقتوں میں بے پناہ اضافہ کر دیتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ آپ اسلام کے برحق ہونے اور اس کے سوا دوسرے تمام افکار و نظریات کے ناحق ہونے کا بے پناہ یقین پیدا کریں تاکہ آپ اس کے پرچوش مبلغ بن سکیں۔ آپ کو اسلام کا تفصیلی علم حاصل کرنا ہے تاکہ دوسروں کے سامنے اس کو واضح انداز میں پیش کر سکیں۔ آپ کو ان خطا افکار و نظریات کے خلاف دلائل فراہم

کرنے ہیں جنہوں نے انسانی ذہنوں کو متاثر کر رکھا ہے تاکہ باطل کو چھوڑ کر لوگوں کو حق کی طرف آنے پر آمادہ کیا جاسکے۔ آپ کو ایک ایک شخص تک پہنچنا ہے اور اس کی نفیات، اس کے حالات اور اس کی قوت فہم کے مطابق اسے بات کھانی ہے۔ آپ کو اسلامی اخلاق کا نہایت اعلیٰ نمونہ بننا ہے تاکہ آپ کی زندگی آپ کے دعوے کی تردید کرنے والی نہ ہو بلکہ اس کی صداقت پر گواہ ہو۔ غرض فرائض کی ایک عظیم فہرست ہے جو آپ سے آپ کی پوری عمر اور آپ کا پورا امانہ منگتی ہے۔ پھر ایسے فرض کو ادا کرنے کی ذمہ داری اڑھنے کے بعد کسی دوسری چیز میں گھسی لینے کا موقع کہاں باقی رہتا ہے۔

یہ ہجرت کی دوسری قسم ہے یعنی دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو چھوڑنا۔ جب دین کی ضروریات اور اپنی ضروریات میں ٹکراؤ ہو، جب دین کا کام آپ سے آپ کا پورا وقت اور آپ کی ساری صلاحیتیں مانگتا ہو۔ جب دین کا تقاضا یہ ہو کہ آپ اپنی خوشی اپنا آرام اور اپنے عزیز و اقارب تک کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھیں تو آپ اپنا سب کچھ اس کے لیے قربان کر دیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہ ہو جس کا تعلق آپ کو دین کی طرف جانے میں روک بن جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے۔

قُلْ إِن كَانِ الْإِنْسَانُ أَدْرَاكَ مَا يَرْجُو وَأَشْرَا بِنَفْسِهِ أَفَرَأَىٰ إِذَا يَدْعُو رَبَّهُ وَقَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كُنْتُ دَاعِيًا ۖ أَفَرَأَىٰ مَا يَكْفُرُ ۖ فَرَأَىٰ عِصْيَانَهُ أَنَّ مَا يَكْفُرُ ۚ
اے نبی کریم! اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری کے لوگ اور وہ مال جو تم نے کما لیا ہے اور تجارت جس کے ماند پڑنے کا کہیں ڈر لگا رہتا ہے اور مکانات جو تم کو پسند ہیں اگر یہ تم کو خدا اور رسول سے زیادہ محبوب ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے مقابلہ میں تم کو ان چیزوں سے زیادہ شغف ہے تو انہیں سب کو خدا کا فیصلہ آجائے۔

(توبہ - ۲۴)

اور اللہ ناسقول کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہے وہ سب کی سب گناہگار ہیں اور ان میں سے کوئی بھی فی نفسہ حرام نہیں ہے مگر مومنین سے کہا گیا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھیں اور جو لوگ ایسا نہ کریں وہ ناسق یعنی مہذب افراد دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبہ ہمارے پیش رو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے کیا تھا جنہوں نے نبی آخر الزماں کے ذریعہ اپنے رب سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ دین کو سر بلند کرنے کی جلد مہم میں اپنی ساری قوت لگادیں گے۔ جب صحابہ کرام کے اس عہد پڑیس سال کی مدت گزر گئی اور انہوں نے مسلسل قربانیوں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ دین کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں تو غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ میں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کی کوششوں کی قبولیت کا اعلان فرمایا:-

إِنَّا لَنَشْتَرِي مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَ
أَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَّهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ فَيُفْتَكِلُونَ وُفُتُونَ وَعَدًا عَلَيْهِ
حَقًّا فِي الْقَوَايِمِ وَإِنْ يُجِيلْ وَالْقُرْآنُ وَمَنْ
أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِنِعْمَةِ
الَّذِي بَالِغُهُمْ فِيهِ وَذَلِكِ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

اللہ نے مؤمنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے
اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے
رہیں، پھر بارگاہے ربہ میں اور اسے جانتے رہیں۔
یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، قورات میں انجیل میں اور قرآن میں
اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے پس
خوش ہو جاؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے اور
یہی بڑی کامیابی ہے۔

(توبہ — ۱۱۱)

یہ ہجرت یا دوسرے نفعوں میں جائز مفادات کی قربانی انسان کی خدا پرستی کا امتحان بھی ہے اور اسی کے
ذریعہ سے خدا کا دین بھی خدا کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ یہ اعلا کلمۃ اللہ کی جدوجہد کا لائحہ ہے۔ جو لوگ اس کام میں
حصہ لینے کے لیے آگے بڑھیں مگر ان کا حال یہ ہو کہ وہ دنیا میں اپنا مقام محفوظ کر لینے کے بعد آخرت کا کام کرنا چاہتے
ہوں، جو اپنے میاں زندگی کو گھٹانے پر تیار نہ ہوں جو اپنے بچوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کریں جو
دنیوی زندگی میں اپنی تناؤں اور خواہشوں کو قربان نہ کریں، جو یہ نہ سوچیں کہ اپنی معاشی مصروفیات میں کی کر کے
دین کی خدمت کے لیے اور زیادہ وقت نکالنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس جو ہمیشہ یہ سوچتے ہوں کہ کس طرح اور
کوئی بڑا کام مل جائے تاکہ اپنے بڑھے ہوئے اخراجات کو پورا کیا جاسکے، مختصر یہ کہ جن کے اندر اتنا حوصلہ ہو کہ
وہ آج کے فائدے پر بلکے فائدے کو ترجیح دے سکیں۔ ایسے لوگوں نے کبھی تاریخ میں دین کو سر بلند نہیں کیا ہو
اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں آئندہ بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں یہ کام نہیں ہو سکتا۔

جہاد

اب جہاد کو لیجیے۔ جہاد کے معنی ہیں کسی چیز کے لیے اپنی آخری کوشش صرف کرنا۔ اتنی کوشش کرنا کہ آدمی تھک
جائے۔ ہجرت کی طرح یہ جہاد بھی کسی وقتی کارروائی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق ساری
زندگی سے ہے۔ جہاد صرف میدان جنگ میں نہیں ہوتا بلکہ ایمان لانے کے بعد ہی اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا
ہے اور زندگی کے آخر لمحات تک جاری رہتا ہے۔ ایک غیر اسلامی معاشرہ میں جہاد کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسی
مکس کے جولیاتی فلسفہ میں ایک نظام کے اندر اس کے ضد کی ہوتی ہے۔ یہ ایک زبردست چیلنج ہے جو کسی نظام کے اندر
اس کے حدود کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ جاہلی معاشرہ میں کسی کا اسلام قبول کرنا دراصل وقت کے خلاف فیصلہ
کرنا ہے۔ یہ فیصلہ اگر صحیح شعور اور مکمل عزم کے ساتھ ہو تو بالکل لازمی نتیجہ کے طور پر معاشرہ کے ہر فرد اور اس کے تمام
اداروں سے اس کا ٹکڑا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وقت کا معاشرہ ہوتا ہے جو اپنے تمام نظری اور عملی پہلوؤں
کے اعتبار سے زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا ہوتا ہے دوسری طرف یہ صاحب ایمان ہوتا ہے جو اس سے مختلف
ایک اور ہی طرز زندگی کو اپنے گرد و پیش کی دنیا میں دیکھنا چاہتا ہے۔ انہوں کے ساتھ اس کا یہ اختلاف اس کو ایک

یہی تیز گیس کی مانند بنادیتا ہے جو کسی محدود دخل کے اندر بند ہوا اور ہر آن اس سے نکلنے کے لیے بے قرار ہو۔ یہ کشش اور جذبہ کا عمل آدمی کے اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے اور تمدن کے مختلف گوشوں میں پھیلتا ہوا ہر اس معاملہ تک پہنچ جاتا ہے جس کا تعلق انسان زندگی سے ہو۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور دن بدن تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کشش کش اپنے آخری نقطے پر پہنچ جاتی ہے۔ بالوں کا بند بٹوٹ جاتا ہے اور جاملی نظام تسکنت کھا کر اسلام کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔

جہاد کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں چلنے کے لیے اپنے آپ کو تھکانا ہے۔ قرآن میں خدا کے دین کو بخدا کہا گیا ہے جس کے معنی بلند مقام کے ہیں اور اس دین پر عمل کرنے کو ادنیٰ خیالی پر چڑھنے سے تشبیہ دی گئی ہے (طہ: ۱۱-۱۰) اس مثال سے ہم جہاد کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ دنیا میں زندگی گزارنے کی صرف دو راہیں ہیں۔ ایک نفس کی خواہش کے مطابق اور دوسری خدا کی مرضی کے مطابق۔ ایک غیر ذمہ دارانہ زندگی ہے اور دوسری ذمہ دارانہ زندگی۔ پہلی راہ بے حد آسان ہے اور دوسری راہ بے حد دشوار پہلی صورت میں اوپر سے نیچے آنا ہوتا ہے اور دوسری صورت میں نیچے سے اوپر جانا۔ گاڑی کو ڈھلوان راستے پر چھوڑ دیجیے تو وہ خود بخود لڑھکتی چلی جائے گی۔ اس کے لیے کسی غیر معمولی کوشش کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر سی گاڑی کو کسی بلندی پر چڑھانا ہو تو مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ایک تھکا دینے والی مشقت کے بغیر کوئی شخص اپنی گاڑی کو نیچے سے اوپر نہیں لے جاسکتا۔ یہی عمل جب وقت اور خواہش کے خلاف اپنی زندگی کو خدا کی طرف لے جانے کے لیے کیا جائے تو اس کو ہم جہاد کہتے ہیں۔

انسان جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے گا، تو اس کو فورا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو ایسی طاقتیں ہیں جو اس کے اس ارادہ کی راہ میں زبردست روک ہیں۔ ایک خود اس کا اپنا نفس دوسرا طاغوت۔ نفس سے مراد انسان کا یہ جذبہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے لیے لذت اور آرام کو پسند کرتا ہے۔ اس کو ہمیشہ آسانی کی تلاش رہتی ہے وہ عزت اور برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے بلکہ جذبہ اس کا جی چاہتا ہے اس طرف نکل جاتا ہے۔ یہ جذبہ اس کو اکٹا تا ہے کہ ہر وہ کام کرے جس سے اس کی ان خواہشوں کو تسکین ملے اور ایسا کوئی کام نہ کرے جس سے اس کی ان خواہشوں پر ضرب پڑے۔ اور طاغوت سے مراد خارج کا وہ غلط اقتدار ہے جو ماحول کی روایات، وقت کے نظریات اور علوم الناس کی خواہشوں کی صورت میں آدمی کے اوپر باوجود ذاتی ہے۔ یہ طاغوت افراد کی زندگی میں متکبرانہ روش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی میں غیر خدائی اقتدار کی صورت میں۔ یہ خارجی قوتیں براہ راست بھی مزاحمت کرتی ہیں اور بالواسطہ بھی۔ بالواسطہ اس طرح کہ سوسائٹی پر ملنا قابض ہونے کی وجہ سے زندگی کے تمام گوشوں میں انھیں کے نظریات پھیل جاتے ہیں۔ انسان کے لیے اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہوتی کہ ان کو مانے اور اپنے آپ کو ان سے ملوث کرے، اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور براہ راست اس لیے کہ اس طرح کے ایک ماحول میں حق پر چلنے کا ارادہ ان قوتوں

کے لیے چیخ کی حیثیت رکھتا ہے وہ راج الوقت نظام کے لیے موت کی پین گونی ہے۔ اس لیے جو لوگ اس قسم کا ارادہ لے کر اٹھتے ہیں وہ ان کو رد کے اور ان کو کپل دینے کے لیے اپنا پورا زور صرف کرتی ہیں اور اپنے دائرہ میں ان کو زندگی کے مواقع سے محروم کر کے رکھ دیتی ہیں۔

ان حالات میں جب کوئی شخص خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کو اپنے اندر سے لے کر ہاتھ کی خیالات سے لے کر عمل کی دنیا تک قدم قدم پر ہتھیار رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کہیں آرام کے مقابلہ میں تکلیف گوارا کرنا ہوتا ہے، کہیں ایک لذیذ رجحان کو چھوڑنے اور ایک خشک عقیدہ کو قبول کرنے کے لیے کش کش کرنی پڑتی ہے۔ کہیں ملتے ہوئے ناجائز فائدوں کے ڈھیر کے بجائے ایک حقیر حاصل پر آمادہ ہونے کے لیے اپنے آپ سے زبردستی کرنی پڑتی ہے۔ کہیں موت اور ناموری کے بجائے گم نامی اور زلزلت پر تعلق ہونے کے لیے مجاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ کہیں اپنے جائز حقوق اور اپنے واقعی مفادات سے محرومی پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ غرض اس کے سامنے دو مختلف راہیں کھلی ہوتی ہیں اور اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ جدھر چاہے چلا جائے۔ ایک طرف جانے میں دنیا کی چیزیں ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور دوسری طرف جانے میں بظاہر کچھ بھی ملتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ آسان راستہ کی طرف جانے۔ خارجی قوتیں اس مقصد کے لیے اپنا پورا وزن اس کے اوپر ڈال دیتی ہیں۔ مگر وہ ان ساری مزاہتوں کے باوجود آسان اور پر لطف راستے کو چھوڑ دیتا ہے اور کچھ کراپنے کو مشکل راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی کش کش کا نام جہاد ہے۔

جس چیز کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں وہ بھی اسی کش کش کا ایک قدرتی نتیجہ ہے جس کے بعد ماحول پر اسلام کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اجتماعی انقلاب برپا کرنا اسلام کا اصل مقصد ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل عمل کا آخری انجام ہے۔ اسلام کے مطابق جیسے اوامر نے کا ارادہ جو ابتداً قلب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ وہ جب عمل کی صورت اختیار کرتا ہے اور ذہن سے نکل کر ماحول میں پھیلنا شروع ہوتا ہے تو اسی پھیلاؤ کے ایک مخصوص دائرہ کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں۔ انقلاب کو مصنوعی درخت کی طرح اگایا نہیں جاسکتا اور نہ اس کو بور یوں میں بھر کر کہیں باہر سے لایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک عمل کے طبعی نتیجہ کے طور پر خود پنی زمین سے ابھرتا ہے۔ جس طرح انڈے کے اندر ایک زندہ بچہ کا وجود یہ منہی رکھتا ہے کہ ایک روز اوپر کاخول ٹوٹ جائے اور جیتا جاگتا بچہ اس کے باہر آجائے۔ ٹھیک اسی طرح مخالف ماحول کے اندر ایک اسلامی گروہ کی موجودگی اس کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔ اگر یہ گروہ اپنے ایمان میں غلصہ ہے اور عقیدہ کو عمل کی شکل دینے کا تہاوم رکھتا ہے تو اس کے منہی یہ ہیں کہ وہ ہر آن باطل کی دیوار کو مترزل کر رہا ہے۔ ایسا ایک گروہ لازمی طور پر دیوار کو توڑ دے گا۔ وہ اس کے اندر نہیں ٹھہر سکتا۔

جہاد ہر اس رکاوٹ سے لڑنے اور اس سے کش کش کرنے کا نام ہے جو دین پر عمل کرنے کے سلسلے میں پیش آئے اور جو یہ رکاوٹ انسان کے اندر سے بھی ہوتی ہے اور باہر سے بھی، اس لیے جہاد میں آدمی کبھی خود

اپنے نفس کے بالمقابل ہوتا ہے اور کبھی غامضی دنیا سے کش کش کرتا رہے۔ اس کو کبھی خود اپنی خواہشوں سے لڑنا ہوتا ہے۔ کبھی زبان سے دوسروں کے طرز عمل پر گزرت کر رہتی ہے اور کبھی ہاتھ کی قوت سے راہ حق کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

جَاهِدْ ذَا الْهَوَا۟ اَعَزَّ كُمْ مِمَّا جَاهَدُو۟نَ
اَعْدَا۟كُمْ (مفردات امام راغب)

اپنی خواہشوں سے جب اور کس طرح تم اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو۔

مگر جہاد اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے صرف کسی ظاہری عمل کا نام نہیں ہے بلکہ اس مخصوص کیفیت کا نام ہے جو کسی عمل کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔ ظاہری شکلیں اسی کیفیت جہاد کو پیدا کرنے کے لیے ہیں نہ کہ خود ان ظاہری شکلوں کا نام جہاد ہے۔ ایک شخص رات دن کی کوشش سے اسلام پر ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب لکھتا ہے۔ ظاہر یہ جہاد کی ایک شکل ہے۔ لیکن اس کا مقصد اگر یہ ہے کہ اس کتاب سے اس کی شہرت ہوگی یا اس کو مالی فوائد حاصل ہوں گے تو اس کے اس عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ جہاد کہے جانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کے برعکس کوئی نیک کام کرتے ہوئے جب اس کے دل میں ایک غلط خیال گزرتا ہے اور اس تصور سے وہ کانپ اٹھتا ہے کہ اس طرح اس کا سارا کیا کرایا شی ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور بے اختیار وہ کہہ اٹھتا ہے کہ :- "خدا یا! مجھے شیطان کے حوصلے نہ کہ ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔" تو یہ جہاد ہے۔

یہ بات صرف جہاد ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دوسری عبادات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ دین میں جو کام بھی کرنے کے لیے بتائے گئے ہیں وہ محض اپنی شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ جن اذکار اور دعاؤں کی فضیلت بیان کی گئی ہے جن عبادات کے ادا کرنے کو فرض قرار دیا گیا ہے، جن اخلاق و اعمال کو یہ اہمیت دی گئی ہے کہ ان کو اختیار کیے بغیر سرے سے دعوئے ایمان ہی معتبر نہیں ہوتا۔ ان سب کا مطلب دراصل یہ بتانا ہے کہ خدا پرستانہ زندگی کے مظاہر کیا ہوتے ہیں نہ یہ کہ کن مظاہر کا نام خدا پرستی ہے۔ اہل میں خدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ یہ نہیں ہے کہ زبان سے اس کے لیے چند تعریفی کلمات کا درکار کیا جائے، نذر روزہ اور حج کے نام پر کچھ مخصوص عبادتی افعال انجام دیے جائیں۔ ہاں میں سے ایک مقررہ حصہ نکال کر غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔ یا زبان و قلم کے ذریعے سے خدا کے دین کی تبلیغ کر دی جاتے۔ بے شک یہی وہ اعمال ہیں جو خدا پرست زندگی کے لیے لازمی پر درگام کی حیثیت رکھتے ہیں اور خدا پر ایمان جب بھی انسانی زندگی میں ظہور کرے گا وہ انہیں شکلوں میں ظہور کرے گا۔ ان کے ظاہر ہونے کا کوئی اور قالب اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا ہے۔ مگر ان غامضی شکلوں کے پیچھے وہ اصل چیز جو خدا کو مطلوب ہے اور جس کی موجودگی کسی آدمی کو اس بات کا مستحق بناتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اسے حاصل ہوں، وہ دراصل دل کی یہ اندر دلی کیفیت ہے کہ آدمی کے جذبات و خیالات بالکل خدا کی مرضی کے تابع ہو جائیں۔ اس کو وہی چیز پسند ہو جس کو خدا پسند کرتا ہے۔ اور وہی چیز ناپسند ہو جس کو خدا ناپسند کرتا ہے۔ جو چیز خدا کی مرضی کے خلاف ہو اس کا وہ دشمن بن جائے اور جو چیز خدا کو محبوب ہو اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ ایسا

آخری سرمایہ تک قربان کر دے۔

قرآن کی اسی تباہی ہوئی زندگی کو پورا کرنے یا نہ کرنے پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ ایک شخص جو اس حقیقت کو جان چکا ہو کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے، اور پھر جو اس واقعہ پر بھی ایمان لایا ہو کہ آخرت کا ایک عظیم دن آنے والا ہے جب پوری نسل انسانی خدا کی عدالت میں گھڑی کی جائے گی۔ اس کی خواہش اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ قیامت کے اس ہولناک دن جب وہ مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہو تو اس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ یہ کہہ دے کہ یہ میرا بندہ ہے جو دنیا کی زندگی میں میل و فساد رہا۔ مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ مقام کسی کو محض خواہش کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی معمولی حکومتوں کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو وفاداری کا سرٹیفکیٹ صرف اس وقت دیتی ہیں جب کہ وہ اس کا دین، اخلاق اور ضمیر سب کچھ اس سے خرید لیتی ہیں۔ پھر خدا جو تمام حاکموں کا حاکم ہے، جو بے حد غیرت مند ہے جو اپنی خدائی میں کسی کی معمولی شرکت بھی گوارا نہیں کرتا، وہ کیا شخص دل کی ایک خواہش یا زبان کی حرکت سے خوش ہو جائے گا اور کسی کو محض اس بنا پر وفاداری کا اعزاز بخش دے گا کہ وہ ایسا چاہتا ہے، خواہ اس نے اپنی وفاداری کو عملاً اس کے لیے خاص کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام وفاداریوں کی طرح خدا کا وفادار بننے کی خواہش بھی ایک عظیم جدوجہد کا تقاضا کرتی ہے۔ دنیا کے اداروں میں کسی کی اہمیت صرف اس وقت تسلیم کی جاتی ہے جب وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اس کے لیے وقف کر دے۔ ایک دکان اپنے اندر نفع کے امکانات کسی کے اوپر صرف اس وقت ظاہر کرتی ہے جب آدمی اپنا سب کچھ اسے دے دیتا ہے۔ حکومتوں کے نزدیک کوئی شخص صرف اسی وقت اعتماد اور احترام کا مستحق بنتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پوری طرح اس کی نذر کر چکا ہو۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی وفاداری کا مقام صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو اپنی قربانیوں کے ذریعہ اس کا امتحان ثابت کر دے۔ شکر نہ دنیا کے مسبودوں کو پسند ہے اور نہ خدا کو۔

اس حقیقت کو سامنے رکھیے اور پھر اس دن کا تصور کیجیے جب ہم اور آپ اور تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کیے جائیں گے کہ ایک رب العالمین کے سوا سب کی آوازیں بے مہرچی ہوں گی۔ جس دن آدمی اپنے سوا ہر ایک کو بھول جائے گا۔ خواہ وہ اس کا دوست اور قریب ترین عزیز ہو۔ جس دن صرف حق بات میں وزن ہوگا اور اس کے سوا تمام چیزیں اپنا وزن کھو چکی ہوں گی۔ جس روز آدمی حسرت کرے گا کہ کاش اس نے ساری عمر صرف آج کی تیاری میں صرف کر دی ہوئی۔ یہ فیصلہ کا دن ہوگا۔ ہمارے درمیان اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے۔ وہ موت جس کے متعلق کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کب آجائے گی۔ آج جو لحظات ہم گزار رہے ہیں اس کے ہر لمحہ کا انجام ہم کو آئندہ کروڑوں سال تک بھگتنا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں اس کے لیے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب۔ زندگی کی مثال ایک ڈھلوان کی ہے جس پر سارے انسان نہایت تیزی کے ساتھ گھلے گئے چلے جا رہے ہیں۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب تر کر دیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لیے مقدر ہے۔

ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں۔ ایسے چند دن جن کا انجام کمزوروں اور اربوں سال نہیں بلکہ
 ابد الّا باد تک بھگتنا پڑے گا۔ جس کا آرام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک۔ ہر بار جب
 سورج غروب ہوتا ہے تو وہ آپ کی عمر میں ایک دن اور کم کر دیتا ہے۔ اس عمر میں جس کے سوائے والے ہولناک
 دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہماری زندگی کی مثال بروت پیچنے والے دوکان دار کی ہے، جس کا آنا
 ہر لمحہ بچل کر کم ہوتا جا رہا ہو اور جس کی کامیابی کی شکل صرف یہ ہو کہ وہ وقت گزرنے سے پہلے اپنا سامان بیچ
 ڈالے ورنہ آخر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو گا اور دوکان سے اس کو خالی ہاتھ اٹھ کر جانا پڑے گا۔ پھر قبل اس
 کے کہ موت آکر ہم کو اس دنیا سے جدا کر دے، جہاں صرف کرنا ہے اور اس دنیا میں پہنچا دے جہاں کرنا نہیں بلکہ صرف
 پانا ہے، ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنی قولوں اور صلاحیتوں کا صحیح مہر صرف سوچ لیں۔ ہم سب کو ایک روز مالک
 کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ پھر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے رب کے پاس اس حال میں پہنچیں کہ دنیا
 میں وہ حق کے لیے اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے انھیں پر نظر کرے گا۔

رتقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام مکتفو، یکم مارچ ۱۹۵۸ء

قرآن کا مطلوب انسان

ایک حدیث ہے کہ — اَلْمُؤْمِنُ مِرَاةُ الْمُؤْمِنِ — یعنی مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔ آج کی محبت میں آپ کے لیے میں بھی بننا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر بہترین خدمت جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ کہ میں نہایت سادہ اور مختصر طور پر چند ایسی باتیں آپ کے سامنے رکھوں جس میں آپ خود کو بالکل برہنہ دیکھ سکیں۔ اللہ میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

ایمان کی علامت کیا ہے۔ اس کی اگر مختصر ترین فہرست بنائی جائے تو شاید وہ دو چیزوں پر مشتمل ہوگی۔ قرآن اور نماز۔ یہ دو الفاظ دراصل پورے دین کا عنوان ہیں۔ ایک فطری حیثیت سے سب سے زیادہ محبت رکھتا ہے اور دوسرا عملی پہلو سے۔ اسی نے دراصل خدا کو پایا ہے جس نے قرآن اور نماز کو پایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اگر آپ کی زندگی میں شامل ہوگئی ہوں تو سمجھیے کہ ایمان اور اسلام آپ کی زندگی میں شامل ہو گیا ہے اور اگر آپ کی زندگی ان سے خالی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ابھی تک ایمان اور اسلام سے محروم ہیں۔

ان دونوں چیزوں کی بنیادی اہمیت خود قرآن سے ثابت ہے، جیسا کہ فرمایا:

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ بِالْكِتَابِ وَآفَاقُوا الصَّلَاةَ جُولُوا فِي خِزْيَانِ كِتَابٍ كُتِبَ لَهُمْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ دُحَانًا يُصْعَقُونَ فِيهَا الْمَصْلُوعُونَ (اعراف - ۱۷۰)

جو یہ صلیح صرف وہ ہے جو قرآن اور نماز کو اپنی زندگی میں شامل کر چکا ہو۔ اے ہی لوگوں کی کو تشنیش خدا کی نظر میں اصلاح کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں کے عمل کو اللہ تعالیٰ دنیا میں برومند کرے گا اور آخرت میں اپنے انعام سے سرفراز فرمائے گا۔ دوسرے مقام پر یہی چیز حکم کے انداز میں کہی گئی ہے:

أَتَكْفُرُ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبِّكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَنْتَ تَكْفُرُ (عنکبوت - ۲۵)

کتاب الہی کا جو حصہ تمہارے پاس بھیجا گیا ہے اس کو پڑھو اور نماز قائم کرو۔

مگر قرآن اور نماز کو پاتے کا مطلب کسی لفظی مجموعے یا کسی ظاہری ٹھکانے کو پالنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک عظیم حقیقت کو پانا ہے جو آدمی کے وجود پر چھا جاتی ہے، جو اس کی پوری زندگی بن جاتی ہے اصل یہ ہے کہ ہر چیز جو آپ کی زندگی میں نظر آ رہی ہو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو آپ نئے حقیقی طور پر اختیار کیا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ آپ کی زندگی کا حقیقی جز نہ ہو بلکہ کچھ دوسرے اسباب کے تحت وہ آپ کے اثاثات البیت میں شامل ہوگئی ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی الفاظ کے ذریعے اپنے بارے میں جو دعویٰ کرے اس کا بحسن القول اس کے خلاف گواہی دے رہا ہو (مزمع - ۲۰) اس کی زبان و قلم سے نہایت اعلیٰ درجے کی باتیں نکلتی رہی ہوں مگر اس کا یہ تمام عمل تَقْوِیٰ لَدُنْ بَآئِهِمْ مَا لَیْسَ فِی قُلُوبِهِمْ (آل عمران - ۱۶۶) کا مصداق ہو رہا کی زندگی کا مرکز و محور اس کے مٹا مٹا فادات اس کی بیوی بچے اور اس کی دنیوی تنائیں ہوں مگر تَعْلَمُوا أَنْ تَقُولُوا

میں وہ اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرے گا یا اس نے خدا اور اس کے دین کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنا رکھا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص امت کی حالت زار پر تقریریں اور بیانات شائع کر رہا ہو مگر اس کی زندگی میں ایک رات بھی ایسی نگزری ہو جب کہ امت کے درد میں اس کی منداڑ جھانے اور بچے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس کی زبان سے نکلے کہ۔۔۔ "خدا یا تو انھیں ہدایت دے، خدا یا مجھے طاقت دے کہ میں ان کو تیرے راستے کی طرف بلا سکوں۔ تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امت کے درد سے زیادہ اس کو خدا بنادرد سنا رہا ہے۔ کیونکہ اس عنوان کو اختیار کے بغیر وہ پریس اور اسٹیج سے اپنے آپ کو نمایاں نہیں کر سکتا۔ میز کے گرد اب چیت میں اگر کوئی شخص مظلوم انسانوں کی حمایت پر گرم گرم حصدے رہا ہو مگر اس کی روزمرہ کی زندگی مظلوم انسانوں کی ہمدردی سے خالی ہو تو یہ ہمدردی کا نہیں بلکہ ریاکاری کا ثبوت ہے۔ دیکھی تم کے بحث و مباحثہ میں اگر کوئی شخص اصول اور ضابطے کا بہت حوالہ دیا ہو، مگر اس گفتگو کے باہر جو زندگی وہ گزارتا ہے وہ بے اصولی کا نمونہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ حقیقتاً اس کے اندر موجود نہیں ہے اس کو وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے اندر ثابت کرنا چاہتا ہے وہ اپنے کو ایک ایسی حیثیت میں ظاہر کر رہا ہے جو کہ دراصل اس کی حیثیت نہیں ہے۔ اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ دوسروں پر تنقید کرنے میں اس کی زبان بہت تیز ہے مگر خود اس کو عمل کے جو مواقع حاصل ہیں ان میں وہ خود بھی اسی قسم کی کمزوریاں ظاہر کر رہا ہے جس میں دوسرے لوگ اپنے دائرے کے اندر مبتلا ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو فی الواقع اصلاح حال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کو صرف تنقید عزیز ہے اور اسی کو وہ انجام دے رہا ہے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ میں ایک مرتبہ ٹراؤنکھور کے علاقے میں ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ میرے سامنے کی سیٹ پر کچھ عیسائی بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ مسلمانوں کے اندر مذہبی اسپرٹ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کا ہر کچھ جب تعلیم شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کو قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ نینک یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ بلکہ مسلمانوں میں تو یہ روایت رہی ہے کہ وہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد سب سے پہلے کتاب الہی کی تلاوت کرتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سطحیت پسندی نے اس ذوق کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اور خاص طور پر پڑھنے لکھنے والوں کی صبح تو اب تلاوت قرآن کے بجائے تلاوت اخبار میں بسر ہونے لگی ہے۔ تاہم اب بھی ہمارے یہاں ایسے مردوں اور عورتوں کی کافی تعداد ہے جو کسی ایسی حد تک اس روایت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس قسم کی تلاوت بھی ایک دینی کام ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ محض الفاظ قرآن کی تلاوت نہیں بلکہ تلاوت حق بنے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے :-

الَّذِينَ آمَنُوا هُمْ أَكْثَرُ النَّاسِ تِلْكَ الْأُمَّةُ
الْمُذْنِبِينَ (البقرہ - ۱۲۱)

جو لوگ کتاب الہی کے حامل ہیں وہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ یہی اس کے حق کی عین ہے۔

یہ تلاوت حتی جس کو حاصل ہوگئی ہو وہی دراصل قرآن کا قاری ہے اور وہی اس پر جمع منوں میں ایمان لانے والا ہے۔ تلاوت حق کی پہچان کیا ہے۔ اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سب سے پہلے یہ آیت آتی ہے۔

وَإِذْ آمَأْنَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ فَخَبَّرَهُمْ مَنْ نَقُولُ
أَنِّي كُنتُمْ تُدَافِعُوهَ هَٰذِهِ الْأَيَّامَ فَلَمَّا أَتَىٰ
أَمْرًا أَنْزَلْنَاهُ فَمِنْهُمْ إِيْمَانًا وَهُمْ يُخْبِرُونَ ٥ (توبہ ۱۲۴)

اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو بعض منافقین کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھا دیا ہے۔ ہاں اس نے ان لوگوں کا ایمان بڑھا دیا ہے جو واقعی مومن ہیں اور وہ اس کو پاکر خوش ہیں۔

اس آیت سے قرآن پر ایمان رکھنے والوں کی پہچان یہ معلوم ہوئی کہ وہ جب قرآن کو پڑھیں تو اس سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو، وہ اپنے بہترین احساسات کو اس کے اندر بولتا ہوا پائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے مقام پر عرفان حق کے نقطہ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا۔

وَإِذْ أَسْمِعُوا أَمَّا أَنْزَلَ إِلَى النَّبِيِّ أَمْرًا فَهُمْ يُخْبِرُونَ
تَفْصِيلٌ مِنَ اللَّهِ يُعَلِّمُهُ الْبَحْثُ - (ماہ ۸۲)

اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو خدا کے رسول پر اترا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں، عرفان حق کے سبب۔

اضافہ ایمان اور عرفان حق دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ جو لوگ قرآن کے واقعی مومن ہیں وہ جب قرآن کو پڑھتے ہیں تو یہ کتاب انہیں سراپا حقیقت نظر آتی ہے، وہ حقیقت جس کے متعلق علم انسانی نے تسلیم کیا ہے کہ وہ کبھی اسے معلوم نہیں کر سکتا وہ حقیقت جس کو فلسفہ ہزاروں سال سے تلاش کر رہا ہے مگر وہ اس تک پہنچ نہ سکا، اہل ایمان اس کو خدا کی کتاب میں پالیتے ہیں۔ قرآن کی شکل میں وہ حقیقت کو دیکھنے لگتے ہیں۔ عظم ان کے یقین کو بڑھاتا ہے، قرآن کے مضامین اپنے پڑھنے والے سے جس قسم کی جوابی کیفیات کا تقاضا کرتے ہیں ان کا دل ہر مقام پر بالکل اس کے مطابق ڈھلنا چلا جاتا ہے۔ جب زمین و آسمان کی نشانیاں پیش کر کے اللہ تعالیٰ

پوچھتا ہے کہ ان کا خالق کون ہے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے، بل انت یا رب، جب خدا کے احکام بیان ہوتے ہیں اور انسان سے اس کی حقیقت کے مطابق نتیجہ روئے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ بکراٹھے ہیں رَبَّنَا أَمَّا فَانْكَبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ - قرآن کو پڑھتے ہوئے دل کے اندر یہ یقین ابھرنا چاہیے کہ یہ خدا کا کلام ہے، جس مطالعہ سے یہ کیفیت حاصل نہ ہو وہ اندر سے بہرے کا مطالعہ ہے۔ (فرقان) مومن جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کو اس طرح پڑھتا ہے گویا وہ رب العالمین کی آواز سن رہا ہے، گویا وہ خدا سے ہم کلام ہے، گویا قرآن خدا کے اوپر نازل ہوا ہے۔ قرآن اس کی سب سے محبوب کتاب بن جاتی ہے جس میں وہ اپنے جذبات کی تکمیل پاتا ہے، جس سے وہ اپنے دل کی دنیا کو آباد کرتا ہے، جس سے اس کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے جو اس کے تمام غفل اور روحانی تقاضوں کا جواب بن جاتی ہے۔

قرآن کا یہ پانامہض ایک علمی دریافت کی قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بندے کا اپنے رب کو پانا ملنا اس تک

ہنچ جانا ہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ بعض لوگوں کے علمی ذوق نے انہیں کتابوں کا عاشق بنادیا۔ یہی کی بھی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ کسی فلسفی یا مفکر کی تصنیفات نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بالکل اس کے مومن ہو گئے۔ مگر خدا کی کتاب کا معاملہ اس قسم کے واقعات سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کائنات کے خالق و مالک کی کتاب ہے اور ہم اس کے حقیر بندے ہیں۔ اس نسبت کا قدرتی تقاضا ہے کہ قرآن سے ہمارا تعلق محض علمی تعلق نہ ہو بلکہ وہ نبی سے اور خدا کا تعلق بن جائے۔ ہم جب قرآن کو پڑھیں تو ہمارے اوپر وہ حبیب طاری ہو جو کائنات کے فرمانروا کا حکم سن کر اس کے ایک عاجز غلام پر طاری ہونی چاہیے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ہمارا دل گھل جائے، ہماری آواز زبانت ہو جائے، ہمارا پورا وجود سر با محراب و نیاز بن کر اس کے آگے جھک جائے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْإِنْشَانَ أَحْسَنَ الْخَلْقِ مِثْ كِتَابًا
مَنْشَأَهُ هَامَانًا ثُمَّ تَمَثَّلَ مِنْهُ حُلُودًا لِّذِينَ
يُحْيُونَ رَبَّهُمْ لَشَعْنِ تَلْبِينٍ حُلُودَهُمْ وَتَلَوْنَهُمْ
إِلَى دِكْرِ اللَّهِ (نور - ۲۳)

وہ اللہ ہے جس نے یہ بہترین کتاب اتاری ہے جس کی باتیں آپس میں ملتی ہوئی دہرائی ہوئی ہیں اس کو سن کر ان لوگوں کے بدن کا لپ اٹھتے ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں پھر ان کے دل اور ان کے جسم خدا کی یاد کی طرف جھکا جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن خدا سے ڈرنے والوں کے لیے کچھ پیارا کر دینے والی کتاب ہے اس کو سن کر ان کے بدن کے رزحے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ انہیں خدا کی طرف مائل کرتی ہے، وہ انہیں دگر دلی میں فروغ کر دیتی ہے، وہ جب اسے سنتے ہیں تو ان کے قلوب گھل کر آنکھوں کے راستے سے بہنے لگتے ہیں۔ قرآن کو سنتے یا پڑھنے کے وقت دل کے اندر خدا کی یاد اور شریعت پیدا ہونا چاہیے، ایسا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی قنوت قلب کی بیماری میں مبتلا ہو چکا ہے۔ (حدید - ۱۶)

یاد رکھیے قرآن سے نا آشنا صرف وہ لوگ نہیں ہیں جن کے لیے یہ کتاب کتاب محبوب بن گئی ہے، جنہوں نے قرآن کو اس طرح پس پشت ڈال دیا ہے گویا کہ وہ اسے جانتے ہی نہیں گویا ان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ شخص بھی قرآن سے محروم ہے جس کے لیے یہ کتاب صرف خوش الحانی کے لیے موزوں الفاظ مہیا کرتی ہو، جس کے لیے وہ محض علمی غور و بحث کا موضوع ہو، جس کے لیے وہ حوالے کی کتاب ہو جس کو وہ تحریر و تقریر کے وقت الٹ پلٹ کر دیکھ لیتا ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص نے ہزاروں انسانوں کے درمیان صرف قرآن کی بنیاد پر اپنی شخصیت کا سکہ بٹھا رکھا ہو، مگر وہ قرآن کی نعمت سے محروم ہو۔ اسی طرح اگر آدمی زبانِ قلم کے ذریعے قرآن کے اسرار و معارف بیان کر رہا ہو مگر اس کی اپنی زندگی ان حقیقتوں سے خالی ہو تو یہی خدا کی کتاب سے محرومی کی ایک قسم ہے۔ دوسروں کو کتاب الہی کا درس دینا اور خود 'لسیان' میں مبتلا رہنا، قرآن سے تعلق نہیں بلکہ بے تعلقی کا ثبوت ہے (نور - ۱۴۴) اگر کسی نے نعمت اور غم کی مدد سے الفاظ قرآن کو حاصل کر لیا ہو تو اس کے منی یہ نہیں ہیں کہ وہ قرآن کو بھی پا گیا ہے۔ قرآن کو پانے والا صرف وہ شخص ہے جس نے

اپنے سینے کی دھڑکنوں میں اس کو بوتے ہوئے سنا ہے، جس نے ان حقیقتوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے جن کا قرآن میں ذکر ہے جس نے اس کو اس طرح پڑھا ہے گویا وہ خود اپنے اندر چھپے ہوئے معنی کو زبان سے دہرا رہا ہے۔ یاد رکھیے حقیقت کو پانے والا صرف وہ ہے جس نے اپنے دل کی کتاب پر اس کو کھلایا ہے۔ جس نے صرف لفظی تشریحات کے ذریعہ اسے جانا ہے، اس نے حقیقت کو ابھی تک پایا ہی نہیں:

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي مَصَدِّقٍ ذِكْرٍ
 قُرْآنَ كَرِيمٍ
 قرآن کیا ہے وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں۔ جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جو معرفت رکھتے ہیں۔ (عنکبوت - ۲۹)

قرآن کی جو صفیات بیان کی گئی ہیں وہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ صفیات بتاتی ہیں کہ قرآن کے وہ کیا پہلو ہیں جن کا ہماری زندگیوں میں شامل ہوجانا ہمارا خدا کی کتاب کو پالنا ہے۔ قرآن کو پائے والا وہ ہے جس کی مردہ روح کو قرآن سے زندگی ملی ہو، جس کے لیے وہ دل کے رنگ کو دہرا کرتے والی کتاب ہو، جس کے لیے وہ ذہن گیا ہو جس کی روشنی میں وہ چلتا ہو۔ قرآن کو ان لوگوں نے پایا ہے جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ اسے پڑھتے ہیں تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں اور وہ اپنے آنسوؤں سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت صاحب قرآن کے آگے سمجھ رہی ہو جاتی ہے۔ یہی وہ علامات ہیں جو بتاتی ہیں کہ آدمی کو قرآن کی تلاوت حق نصیب ہوئی ہے یا نہیں اور اس نے فی الواقع خدا کی کتاب کو پالیا ہے یا وہ ابھی تک اس سے محروم ہے۔

اِذْ اَنْتَ اُنْتَلٰی عَلَیْهِمُ الْآیٰتِ الْخٰسِرٰتِ خَرُّوْا سَجْدًا
 حُبُّ اللّٰهِ کِی آیتیں انھیں سنائی جاتی ہیں تو وہ روٹے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ (مریم - ۵۸)

مہربان! ایک بات ابھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام چیزوں کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز سے آدمی نصیحت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہی سبک وقت اس کے لیے فتنے میں پڑنے کا بھی ذریعہ ہے۔ ٹھیک یہی حال خدا کی کتاب کا بھی ہے، جیسا کہ فرمایا:

كَذٰلِكَ يُفَصِّلُ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَبِمَدَدِیْ
 اِی طرح اللہ قرآن کی آیتوں سے کسی کو گمراہ کرتا ہے اور کسی کو ہدایت دیتا ہے۔ (مدثر - ۱۳۱)

بلاشبہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ مگر آدمی کا اپنا چہرہ جناب صفات ہوگا اتنا ہی زیادہ آئینہ کے اندر صاف دکھائی دے گا۔ چنانچہ قرآن سے بھی آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جو وہ اس سے حاصل کرنا چاہتا ہو۔ قرآن کے ذریعہ بے راہ ہونے کی ایک صورت تو وہ ہے جب کہ آدمی اس میں سے ایسی باتیں ڈھونڈ لے جو اس کے لیے قرآن پر ایمان نہ لانے کا بہانہ بن جائیں۔ مگر جو لوگ قرآن کو مانتے ہیں وہ بھی اس خطرہ سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس قسم کی ممکن صورتوں میں سے ایک وہ ہے جس کا عنوان تحریف ہے، یعنی سب کچھ جاننے کے باوجود محض اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کلام الہی کے الفاظ یا اس کے معانی کو بدل دینا (بقبرہ - ۷۵)

دوسری چیز اقسام ہے (عمر ۱۰۰) اقسام کے معنی ہیں بانٹنا، تقسیم کرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خدائی تعلیمات کو پوری شکل میں قبول نہ کیا جائے بلکہ اپنی خواہش کے مطابق ٹکڑے کر کے اس کے بعض حصوں کو لیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ تیسری چیز وہ ہے جس کو قرآن میں مضامین کہا گیا ہے (توبہ ۳۰) مضامین کے معنی عربی زبان میں مشاغلۃ السخی بالاشیاء کے آتے ہیں (السان العرب) یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ہم شکل قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل باطل کے خیالات سے متاثر ہو کر یا دنیوی مصالح کی بنا پر ان کی بات کو اپنایا جائے اور اس کو اس طرح پیش کیا جائے گویا وہ خدائی تعلیم کے عین مطابق یا اس کے مشابہ ہے۔

جہاں تک پہلی صورت (تحریف) کا تعلق ہے اس کی بنیاد مکمل طور پر بدینتی کے اوپر قائم ہے۔ اور ہم سب لوگ اس کی برائی سے ابھی طرح واقف ہیں۔ مگر دوسری اور تیسری صورت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ بدینتہ کبھی کبھی اچھے خاصے نیک نیت لوگوں میں بھی اس طرح چپکے سے داخل ہو جاتا ہے کہ انھیں خبر نہیں ہوتی اور وہ انکا تمام کام کر کے بالآخر انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان اکثر حالات میں متاخر ذہن کے ساتھ واقعات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وقت کی سوسائٹی میں جن خیالات کی اہمیت تسلیم کی جا چکی ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر وہ ان کا اثر قبول کرتا ہے۔ اسی طرح حقیقی دنیا کی بہت سی مصیبتیں معصوم مکمل میں آکر اس کے ذہن کی سطح سے بار بار ٹکراتی رہتی ہیں۔ یہ چیزیں مل کر کبھی شوری اور زیادہ تر غیر شوری طور پر اس کا ایک فکر بنادیتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ چیزوں کو صرف اس حقیقت سے نہیں دیکھتا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اکثر حالات میں وہ مجبور ہوتا ہے کہ چیزوں کو اس حیثیت سے دیکھے جیسا کہ اس کا ذہن انھیں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص ایک خاص ذہن کے لوگوں کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ بلا ارادہ اقسام کی ایک صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ قرآن کی بعض ایسی باتوں کو تو لے لیتا ہے جو اس کے ذہن کے چوکھٹے میں بیٹھ سکتی ہوں اور باقی تمام باتوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ سارا قرآن پڑھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے خدا کی کتاب کو پالیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ اس نے خدا کی کتاب کے بڑے حصہ کو چھوڑ کر اس کے بعض اجزہ کو اپنے خود ساختہ مفہوم میں لے لیا ہے۔ اس نے جو چیز پائی ہے وہ وہی ہے جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی اور جس کی تائید یا انفاق سے قرآن کی بعض آیتیں بھی اسے ہاتھ آگئیں۔ ایسے آدمی کی مثال اس تعلیم یافتہ نوجوان کی ہے جو انجی بے کاری سے پریشان ہو اور صرف "ضرورت ملازمت" کے استہزات دیکھنے کے لیے اخبار کا مطالعہ کرتا ہو۔ یہ نوجوان اپنے اس مطالعہ سے ممکن ہے ملازمت کی درخواست بھیجنے کے لیے کچھ نئے حاصل کرے مگر وہ دنیا کی سیاست سے بے خبر رہے گا اور اخبار بینی کے اہل مقصد کو حامل نہ کر سکے گا۔

اسی طرح مضامین کی قربانی بھی آدمی کے اندر خاموشی کے ساتھ داخل ہو جاتی ہے۔ اس میں ماحول کے اتنی تاثر کے علاوہ خاص طور پر تبلیغی ضروریات کا بھی کچھ دخل ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ حیات لوگوں سے کہنی ہے وہ ایسی

ہونی چاہیے جو لوگوں کے ذہن سے قریب تر ہو تاکہ وہ اس کو قبول کر سکیں۔ نیز یہ کہ بات کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کیا جائے کہ وقت کا معیار فکر اس کی اہمیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو، وقت کے علمی خیالات کے ساتھ وہ پلور پلور جگہ لے سکے۔ یہ اگرچہ بذات خود غلط نہیں ہے مگر بعض مرتبہ آدمی کے ذہن میں خدائی تعلیمات کی ایسی تصویر بناتا ہے جو اصل تعلیمات سے زیادہ وقت کے نظریات سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ خدائی تعلیمات سے جزوی مشابہت تو ضرور اس میں موجود رہتی ہے۔ مگر درحقیقت وہ اسلامی الفاظ اور اصطلاحات میں غیر اسلامی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اگر بے جا حبارت نہ ہو تو میں عرض کر دوں گا کہ تصوف جو ایک دائے کے مطابق یونانی لفظ تھیوسوفیا^۱ (Theosofia) کی تعریف ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں بعض خارجی اثرات کے تحت اسلام کے اندر داخل ہو گیا۔ ہمارے قدیم بزرگ جب اسلام کا پیغام لے کر عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں گئے تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں کچھ مخصوص افکار و اشغال لوگوں کے ذہنوں پر بھائے ہوئے تھے اور مذہب اور مذہبی زندگی کا تصور ان کے بغیر نہیں کیا جاسکتا تھا یہی نہیں بلکہ انی افکار و اشغال کی ہیئت پر ایک زبردست فلسفہ بھی موجود تھا۔ ان چیزوں نے کچھ دعویٰ مصلحت اور کچھ انفعالی تصور کے تحت ہمارے بزرگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کو اس رنگ میں پیش کریں جس سے لوگ پہلے سے مانوس ہیں۔ اس طرح نبوت کے تقریباً دو سو سال بعد اسلام کی تصوف نامہ تعبیر ہماری تاریخ میں داخل ہو گئی۔

اب قدیم روحانی انداز میں سوچنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں مانوس رہنے میں جی کہ ہر طرف معاشی اور سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ آج کا انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے کو بدل کر کسی اور بنیاد پر دنیا کا نظام چلایا جائے۔ یہ اسی قسم کا ایک نیا فتنہ ہے جس سے ہمارے پیش روؤں کو سابقہ پیش آیا تھا۔ وہ اگر تعبیر روحانیت کا فتنہ تھا تو یہ تعبیر مادیت کا فتنہ ہے۔ اب اگر ہم نے اس فتنے کو نہ پہچانا اور اس سے اپنے ذہن کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی تو ہم بھی دین کی تعبیر میں اسی قسم کی غلطی کریں گے جو اس سے پہلے مونیابے گرام سے ہو چکی ہے۔ اور پھر قرآن کی ایک نئی تفسیر کر کے قدیم روحانی تصوف کی طرح اسلام کو ایک جدید سیاسی تصوف بنا کر رکھ دیں گے۔ اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لیے مقدر ہیں۔

۱۔ تصوف کی اصل کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ دوسری دنیا وہ مقبول رائے یہ ہے کہ یہ لفظ صوف (ادون) سے بنا ہے۔ ابتدائی زمانہ میں اس طبقہ کے لوگ اکثر ادون کا معمولی لباس پہنتے تھے اس لئے ایسے لوگوں کو صوفی اور مان کے طریقہ کو تصوف کہا جانے لگا۔

نماز

اب نماز کو بھیجے۔ نماز دین کا بنیادی ستون ہے۔ اس کے بغیر کسی کا ایمان ہی معتبر نہیں۔ وہ آدمی کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ (حدیث) مگر یہ فائدہ صرف اس نماز سے حاصل ہوتا ہے جو مصلوۃ خُشوع ہو، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِي تَرْتَعْنٰهُ فِيْ سَلٰوٰتٍ مُّسْتَسْمِعٍ
خَافِعٍ ۝

(مومنوں - ۱۲) اختیار کرتے ہیں۔

میں سہاں چند چیزوں کا ذکر کروں گا جس سے معلوم ہو گا کہ مصلوۃ خُشوع کیا ہوتی ہے اور اس کی علامات کیا ہیں۔

پہلی بات یہ کہ اس سے مراد وہ نماز ہے جو اس طرح پڑھی جائے کہ آدمی اس کا لگاؤ اور محافظ بن گیا ہو،

حَافِظُوْهُ عَلَى الصَّلٰوٰتِ (نہرہ - ۲۳۸) اپنی نمازوں کی حفاظت کرو۔

یہاں حفاظت سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی روزانہ زندگی کو ہر اس چیز سے بچائے جو اس کی نماز میں خلل ڈالنے والی ہو، جس سے وہ اپنی نمازوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے، اس میں وقت کا اتہام خاص طور پر دخل ہے۔ محافظت مصلوۃ، اپنے اچھے بھروسے ہوئے مفہوم کے لحاظ سے، محافظت اوقات کا دوسرا نام ہے۔ نماز اہل ایمان کے لیے کتاب مرقوت ہے جس کو تین لمحات میں رکوع کرنے والوں کے ساتھ باجماعت ادا کرنا ہے۔ اس لیے آدمی کو ہر اس عادت یا ہر اس مشغولیت سے اپنی زندگی کو بچانا اور پاک کرنا ہے جو اس کو وقت پر نماز باجماعت کی ادائیگی سے محروم کر دے یا تکبیر تحریم کے وقت وہ مسجد کی صف میں کھڑا ہوا نظر آئے۔

ٹھیک وقت پر نماز کے لیے حاضر ہونا محض فوجی ڈسپلن کی قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ دراصل بندے کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ ہے کہ وہ آقا کی پکار پر فوراً دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے گھر سے ”آؤ نماز کی طرف“ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں تو خدا کا بندہ ہر دوسری مشغولیت سے اپنے آپ کو خارج کر کے خدا کی پکار کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ یہ انتہائی آمادگی اور انتہائی تعلق کا ثبوت ہے۔ وقت آنے ہی نماز کے لیے دوڑ پڑنا اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی میں اولین مقام صرف خدا کو دے رکھا ہے۔ مگر جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ گویا اس بات کا مظاہرہ کرتا ہے کہ خدا کے سوا دوسری چیزوں کو بھی وہ اپنی عبادت میں شریک کیے ہوئے ہے۔ وہ یا تو بے حس کا شکار ہے یا کسی دوسری مشغولیت کو اس نے اپنی زندگی میں وہ مقام دے رکھا ہے جو دراصل خدا کا ہونا چاہیے۔

مسجدوں کی صف بندی دراصل خدا کے دربار میں کھڑے ہونے کا وقت ہے۔ جو اس اہم ترین وقت پر خدا کے گھر میں نظر نہ آئے یا دیر سے پہنچے وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو خدا کی پکار سے زیادہ اپنے نفس کی پکار عزیز ہے۔ عین اس وقت بھی وہ اپنے آپ کو دوسرے مشاغل میں مصروف رکھتا ہے جب خدا کے بندے خدا کے حضور کھڑے ہو رہے ہوتے ہیں۔ ایسے آدمی کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ خدا کی یاد سے غافل ہے۔

رومانہ ہو جاتے ہیں۔ ملازم اپنے دفتروں کی تیاری شروع کر دیتے ہیں اور بہت سے لوگ جنہیں صرف آرام عزیز ہے وہ اس سہانے وقت میں اپنے نرم بستروں سے لیٹ جانے کو موزوں ترین خیال کرتے ہیں۔

کس قدر غافل ہے انسان جو اس وقت بھی محروم رہتا ہے جب کہ پانے کے امکانات سب سے زیادہ ہوں۔ ایک دروازہ جو ہر روز انسان کے لیے کھلتا ہے مگر نادان انسان ہر روز اسے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

صلوۃ مشروع کی دوسری پہچان یہ ہے کہ نماز میں آدمی کا جھکنا اس کی پوری زندگی میں اسی قسم کے جھکاؤ کا عنوان بن جاتا ہے۔ اس کا رکوع اور سجدہ دراصل اس بات کا ایک عملی اقرار ہے کہ اس نے پوری زندگی خدا کے آگے ڈال دی ہے وہ مکمل طور پر خدا کے حکم کا پابند بن چکا ہے۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْتَهِي عَنْ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (مکوتہ - ۴۵) نماز بدکاریوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

ایک نبی نے جب لوگوں کو خدا کا عبادت گزار بننے کی دعوت دی تو ان کی قوم جس نے اپنی زندگی کی باگ اپنے نفس کے حوالے کر دی تھی اور کسی دوسرے نظام اطاعت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی، اس نے جوبلایا: يَا مُجِيبُ أَسْئَلُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ تَكُونَ مَلَكِيًّا اے شعیب! کیا تمہاری ناز باتی ہے کہ ہم ان چیزوں کی "باجوڑاؤاں" نفع لے کر ان کے اموال کو مٹا دے؟ عبادت چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے

آئے ہیں اور ہمارے مالوں میں ہماری مرضی کا کوئی دخل نہ ہو۔

ہود - ۸۴

اس سے معلوم ہوا کہ نماز محض رکعی قسم کی پوجا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود اور تمام اُتاشے کو خدا کے آگے ڈال دینے کا نام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ خدا کے حضور جھک کر زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ میرے آقا تو مجھے ہم دے! میں تیرے حکم کی تعمیل کروں گا۔ اس اقرار کے باوجود اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ اس کی مسجد کی نماز اس کی پوری زندگی کی نازیبا نہیں بنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک صلوۃ مشروع سے محروم ہے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق جس نماز کے ساتھ "اتباع شہوات" پایا جا رہا ہو، وہ ایسی نازیبا ہے جس سے روح صلوۃ منقطع ہو چکی ہے (مریم - ۵۹)

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کی نمازیں بہت اچھی نہ ہیں تاہم وہ نماز تو پڑھ لیتے ہیں اور یہ بھی بہر حال فرض کی ادائیگی کے لیے کافی ہے۔ مگر یہ صرف شیطان کا دھوکہ ہے۔ یاد رکھیے اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ ذکر قلیل نہیں، بلکہ ذکر کثیر ہے۔ ذکر قلیل کو تو منافقوں کی پہچان بتایا گیا ہے۔ (نار - ۱۱۲)

صلوۃ مشروع کی تیسری اور آخری پہچان یہ ہے کہ بندہ جب نماز میں مشغول ہو تو وہ اپنے آپ کو خدا سے بالکل قریب محسوس کرے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَأَشْبَهَنَّ وَأَقْرَبَنَّ (علق - ۱۹) سجدہ کر اور قریب ہو جا

یہ سجدہ قریب کیا چیز ہے اس کو شاید لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جب آدمی اس عالم میں پہنچتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ایک انوکھی حقیقت کو کامل یقین کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ ایک بعید ترین چیز سے

جنہائی طور پر قریب ہے، کسی مغالب کی موجودگی کے بغیر کامیاب ترین گھٹگو میں مصروف ہے۔ ایک سب سے زیادہ پختہ چپکے لیے اپنے اندر سب سے زیادہ محبت کے جذبات پارہا ہے۔ ایک چیز جس کو بظاہر کسی واسطہ کے ذریعہ محسوس نہیں کیا جاسکتا کسی واسطہ کے بغیر وہ اس تک پہنچ گیا ہے:

گویا سجدہ جو نماز کی انتہائی حالت ہے، وہ بیک وقت خدا سے قریب ہونے کی بھی انتہائی حالت ہے نماز کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ ہم دنیا میں رہتے ہوئے اس کی محبت اور قربت حاصل کر سکیں۔ نماز کے ذریعہ آدمی جب اپنے آپ کو خدا کی طرف متوجہ کرتا ہے تو وہ روحانی طور پر خدا سے جڑ جاتا ہے وہ یاد الہی کی ایسی حالت اپنے اوپر طاری کرتا ہے جب کہ وہ مکمل طور پر ایک حیاتی وجود بن جاتا ہے اور تصور ہی دیر کے لیے اپنے آپ کو خدا کے اندر گم کر دیتا ہے۔ وحدت وجود کا تصور غالباً اپنی ابتدائی شکل میں محض اس کیفیت کو تلبس کے لیے تھا جو تصور الہی میں غرق ہونے کے وقت آدمی کے اوپر طاری ہوتی ہے مگر بعد کو منطقی معین کی کوشش نے اس کو سہرا درست کے ناقابل فہم غلطے تک پہنچا دیا۔ اگر اس بدنام عقیدے کے متعلق میری تشریح کو مرجع مانا جائے اور اس کو محض حیاتی ارتباط کے مفہوم میں لیا جاسکے تو میں کہوں گا کہ سجدہ قربت کے وقت آدمی پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے اظہار کے لیے شاید انسانی زبان میں یہ ایک قریب ترین تعبیر ہے جب سر دنگی کا لٹو اتار ہے، جب غمزہ اور محدودیت کا بیکار اپنے آپ کو لامحدود کمال کے حوالے کر دیتا ہے، جب پیشانی اس طرح کھینچ اٹھتی ہے گویا وہ زمین سے چپک گئی ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے گویا قطرہ نے اپنے آپ کو سمندر میں ڈال دیا ہے، گویا انسان خدا سے جلا ہے۔

خاتمہ

یتلاوت حق اور صلوة خشوع کی مختصر ترین تشریح ہے جو میں نے آپ کے سامنے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کچھ نئی باتیں نہیں ہیں۔ ہر شخص جس نے قرآن کو پڑھا ہے وہ ان باتوں کو بخوبی جانتا ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے آج آپ کے سامنے ان کو اس لیے دہرایا ہے تاکہ انھیں یاد دلا کر آپ سے یہ عہدوں کو آپ ان کو اپنی زندگیوں میں مثال کریں گے۔ آپ میں سے ہر شخص کو کسی دوسرے سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے اس معاہدہ پر سبیت کرنا ہے کہ وہ اپنے علم کو اپنا حاس بنائے گا۔ وہ کچھ جانتا ہے اس کو افسوس کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر آپ سچ سچ یہ اقرار کر لیں تو یقین مانے کہ یہ کائنات آپ کے لیے سلام و مرحبا کی آواز سے اس طرغ گونج اٹھے گی کہ آپ کے کان اس کی آوازیں سنیں گے، اور آپ کے لیے خدا کی جنت کے دروازے اس طرح کھول دیے جائیں گے کہ آپ جیتے جی اس کی خوشبو محسوس کریں گے۔ اور اگر آپ اس عہد کے لیے تیار نہ ہوں تو وہ سب کچھ جوا جالے میں ہے اور وہ سب کچھ جانا بھیرے میں پھینکا ہوا ہے۔ حواہ ہے کہ خدا کے میاں اب آپ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا بلکہ اگر آپ ان باتوں کو پیچھے سے جلتے ہیں، آپ نے خود اپنے اوپر محبت تمام کر دی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے کو نہیں بدلتے تو مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے پاس وہ کونسا سہارا ہے جس کے بل پر آپ رب العالمین کے سامنے اتنی بڑی جسارت کر رہے ہیں۔ (زندگی ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)

تقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند، بمقام بڑایوں، ۱۶ اپریل ۱۹۶۱ء

مومن کی تصویر

آج کا یہ اجتماع جس میں ہم آپ جمع ہوئے ہیں، یہ گویا ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے جماعت اسلامی کی دعوت پر ملک کے گوشے گوشے سے یہاں جمع ہو کر آپ نے اس بات کا مظاہرہ کیا ہے کہ پچھلے پندرہ سال کے اندر ہم اس ملک میں کتنا کام کر چکے ہیں اور یہاں جو کارروائی انجام پائے گی وہ ہماری طرف سے اس بات کا اعلان ہو گا کہ آئندہ ہم اس ملک میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا ماضی اور مستقبل کے درمیان کا ایک وقفہ ہے جس کو ہم دارالسلطنت یا قرآن کے الفاظ میں اس ملک کے اتم القریٰ میں گزار رہے ہیں۔ اس وقت میں جو کچھ عرض کر دوں گا وہ ہمارے اس تاریخی دن کے دوسرے پہلو کا ایک جز ہے۔ خدامیری اور آپ کی مدد فرمائے۔

حضرت معاذ خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ایک گفتگو کی رد وادان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

قَالَ الْاَدْلُكَ بَرَأْسَ الْاَمْرِ عَوْجًا وَفَرَوْجًا
سَنَامِيَةً ثَلُثُ بَنِي يَادُوسَ الْاَلْبَنِي - قَالَ
رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَوْجُهُ الْفَسَادُ
وَفَرَوْجُهُ سَنَامِيَةُ الْاَجْيَادِ
(احمد ترمذی، ابن ماجہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا، کیا میں نہیں تاؤں کہ
دین کا سر کیا ہے اور اس کا ستون کیا ہے اور اس کی رسی
مہنہ چوٹی کیا ہے۔ میں نے جواب دیا: ہاں اے خدا کے
رسول! آپ نے فرمایا۔ دین کا سر اسلام ہے، اس کا ستون
نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔

اس حدیث کے مطابق دین کے تین درجے ہیں۔ اسلام، نماز اور جہاد۔ یہ تین الفاظ دراصل تین مختلف عمل کے عنوانات ہیں جو ایمان لانے کے بعد کسی کی زندگی میں ابھرتے ہیں۔ اسلام اس کا پہلا عمل اور اس کی بنیاد ہے اور نماز وہ چیز ہے جو اس عمارت کو اوپر اٹھاتی ہے اور جہاد اس کی آخری منزل ہے۔ سب سے پہلے اسلام کو کیجیے۔ اسلام کے معنی سپردگی اور حوالگی کے ہیں۔ بندہ جب اپنے خدا کو پالے اور اپنے آپ کو بالکل اس کے حوالے کر دے تو اسی کو اسلام کہتے ہیں۔ اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کا فانی اللہ ہے جس میں بندہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور جمائی طور پر اپنے الگ وجود کو باقی رکھتے ہوئے نفسیاتی طور پر خدا کی ہمتی میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ آدمی کے پورے وجود کا خدا کے تصور میں ڈھل جانا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ ہمارا ذہن اس حقیقت پر بالکل مطمئن ہو جائے کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے۔ ہمارے احساسات میں وہ اس طرح شامل ہو جائے کہ رگ رگ میں ہم اس کی کھٹک محسوس کرنے لگیں، ہم اپنے آپ کو اس طرح اس کے حوالے کر چکے ہوں کہ کسی معاملے میں اس کے خلاف جانے کا تصور تک نہ کر سکیں۔ ہمارا ذہن اسی کے بارے میں سوچنا ہو اور ہمارے جذبات اسی کے لیے متحرک ہوتے ہوں، ہم سب سے زیادہ اس سے ڈرتے

ہوں اور سب سے زیادہ اس سے محبت کرتے ہوں۔ جس شخص کی یہ کیفیت ہو جائے وہی دراصل اسلام کو قبول کرتا ہے۔ اسلام تسلیم و تقویٰ کی وہ آخری قسم ہے جس میں بندہ اپنے فکر کو، اپنے جذبات کو، اپنے وجود کو اور اپنے سارے اُٹانے کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور اپنے پاس کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا ذکر ہے وہاں اسی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے کو ذبح کر رہے ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ خدا مجھ سے میرے لڑکے کی قربانی مانگ رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً لڑکے کو لیا اور اس کو لٹا کر اس کی گردن پر چھری رکھ دی۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے:

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّہُ لِلْجَبِّینِ ﴿۱۳۳﴾
 جب وہ دونوں مسلم ہوئے اور ابراہیم نے اسمعیل کو پیشانی کے بل ڈال دیا۔

حضرت ابراہیم کا عمل اسلام کی حقیقی تصویر ہے۔ یہ خواہگی اور سپردگی کی انتہا ہے کہ خدا کی طرف سے جو حکم بھی آئے بندہ فوراً اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر اس کو موس ہو کر اس سے اپنے لڑکے کو ذبح کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے تو وہ بے تکلف اپنے گھر کو زمین پر لٹائے اور اس کی گردن پر چھری چسلا دے۔

یہی اسلام خدا پرستانہ زندگی کا آغاز ہے۔ جب آدمی اس طرح مسلم اور طبع ہو جائے تو وہ دین کا سرا بکڑتا ہے۔ اس مکمل حوالگی کے بغیر کسی کی زندگی حقیقی معنوں میں خدا پرستانہ زندگی نہیں بن سکتی۔ اس حوالگی میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آدمی کی زندگی میں کمی رہ جائے گی۔ مثلاً ایک شخص نے اگر اپنے ذہن کو خدا کے حوالے کیا ہے مگر اس کے احساسات پر خدا کا غلبہ نہیں ہوا ہے تو وہ اسلام کا صرف ایک دیکل بن کر رہ جائے گا۔ وہ اسلام کے لیے مجتنب کرے گا اور دوسروں پر تنقید کرنے میں اس کی زبان بہت تیز ہوگی۔ مگر اس کی اپنی زندگی خدا پرستی سے خالی ہوگی۔ کوئی شخص اگر اسلام کی طرف اس طرح آئے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا نفع حاصل کرنا چاہتا ہو تو وہ خدا پرستی کو اسی حد تک اختیار کرے گا جس حد تک اس کے دنیوی مفاد کو نقصان نہ پہنچے۔ جہاں اس کا دنیا کا فائدہ خطہ میں نظر آیا وہ خدا پرستی کو ترک کر دے گا اور دنیا کے بت کو پوجنے لگے گا۔ جو شخص کسی سطحی تاثر یا وقتی جذبات کے تحت اسلام کی طرف مائل ہو گا وہ چند دنوں تو بڑی سرگرمی دکھائے گا مگر اس کے بعد شہنشاہٹ چھوٹ جائے گی۔ یا جہاں سے آیا تھا وہیں واپس چلا جائے گا۔ جو شخص اسلام کی طرف اس طرح آئے کہ وہ اپنی خوری کے بت کو بھی ساتھ لیے ہو وہ خدا کے دین کی ان چیزوں کو بڑی خوشی سے لے لے گا جو اس کے ذوق کے مطابق ہوں گی اور جو چیز اس کے ذہنی سانچے میں فٹ نہ ہوگی وہ اسے رد کر دے گا۔ جو شخص اسلام کے ناقص مطالعہ کے تحت محض اس کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف آئے وہ اپنے لپیٹیدہ پہلوؤں کے بارے میں تو خاموشی مگر گہرا غور سے تقریر کرے گا گویا وہ صحابہ کرام سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ مگر دوسرے پہلوؤں سے اسے کچھ زیادہ

دل چپ نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اسلام کو اپنے قومی اور تحریری جذبات کی تسکین کے لیے اختیار کرے تو وہ قومی جوش و خروش اور تحریری اخلاقیات میں تو بہت نمایاں نظر آئے گا۔ مگر حقیقی اسلامی اسپرٹ اور اسلامی اخلاقیات کا اس کے اندر کہیں نہ نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ جو لوگ مکمل حوالگی کے بغیر دین کی طرف آئیں ان کی کمزوریاں اس حد تک پہنچ سکتی ہیں کہ ایک شخص کو صبح سات بجے کسی دینی کام کے لیے بلایا جائے گا اور وہ کہے گا کہ میں تنے سویرے نہیں آسکتا کیونکہ وہ میرے چائے پینے کا وقت ہے۔ ایک شخص کو کسی اسلامی اجتماع کے پروگرام میں حصہ لینے کے لیے رات کو گیارہ بجے کا وقت دیا جائے گا اور وہ جواب دے گا کہ گیارہ بجے تک میرے لیے سو جانا ضروری ہے۔ اس لیے میں اس پروگرام میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص سے کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو صلاحیت دی ہے اس کو دین کی خدمت میں لگاؤ مگر وہ کہے گا کہ میں تو دنیا کی خدمت کروں گا کیونکہ دنیا کے بازار میں میری صلاحیتوں کی زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ ایک شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود ہر وقت کھانے کپڑے کی فکر میں مبتلا رہے گا، اس کی مجلس میں ہر وقت روپے پیسے کا تذکرہ ہوگا اور جب اس سے کہا جائے گا کہ مومن کے گھر میں خدا اور آخرت کا پرچا ہونا چاہیے تو وہ بھڑک کر بولے گا کہ ہاں یہ مومن کا نہیں کاغذ گھر ہے۔ ایسا شخص اپنے آپ کو اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کرے گا لیکن اگر اس کی روزانہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام سے زیادہ اس کا ذہن اپنے ذاتی مسائل میں دلچسپی لیتا ہے، وہ اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے زیادہ نجی شتم کے شغلوں میں اپنا وقت صرف کر رہا ہے، وہ اپنی مائش کمانے اور اپنے عوی بچوں کے مطالبات پورے کرنے کے لیے تو سارے جتن کرتا ہے مگر اسلام کا کوئی کام کرنا ہو تو معمول معمولی باتوں کو معذرت نالتا ہے۔ اس قسم کی کمزوریاں جہاں نظر آئیں، سمجھ لیجیے کہ اس کا ایک ہی سبب ہے، وہ یہ کہ آدمی کے اندر مکمل حوالگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے دین کی طرف نہیں آیا ہے۔ اس نے ادھوری شکل میں اسلام قبول کیا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں چند مخصوص چیزوں کو اسلام کہا گیا ہے۔ مثلاً حدیث جبریل میں ہے کہ آپ سے پوچھا گیا: اے محمد! بتائیے اسلام کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: اسلام یہ ہے تم لا اللہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بشرط استطاعت بیت اللہ کا حج کرو۔ اس طرح کی اور بھی روایتیں ہیں جن کو دیکھ کر بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہی وہ چند چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام اسلام ہے مگر اس قسم کا شبہ بھی کر سکتا ہے جو ان احادیث کو پوری شریعت سے الگ کر کے دیکھے۔ قرآن و حدیث کی ساری تعلیمات کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ چند چیزیں کل اسلام نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام کے چند علاقائی پہلو ہیں۔ کلمہ توحید کا اقرار اپنے اندر ایک فکری انقلاب کا اعتراف ہے۔ نماز اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے آگے جھک گیا ہے۔ زکوٰۃ اپنے مال و اسباب کو خدا کے لیے وقف کر دینے کا اعلان ہے۔ روزہ اس بات کا

عزم ہے کہ بندہ اپنے رب کی خاطر ساری مشقتیں بھیلنے کے لیے تیار ہے اور حج گویا آدمی کی طرف سے اس تقویٰ کا اظہار ہے کہ وہ دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو چھوڑ کر خدا تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کلمہ توحید اور نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ بذات خود مکمل اسلام نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام سے پیدا ہونے والی انفرادی کیفیات کے چند نشان ہیں۔ یہ مکمل حوالگی کی علامتی تصویر ہے نہ کہ انھیں کا نام مکمل حوالگی ہے۔

یہ چیزیں جن کا حدیث میں ذکر ہے یہ شریعت کی وہ مخصوص چیزیں ہیں جن کو ہمارے اوپر فرض قرار دیا گیا ہے اور فرائض کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ راستے کی حد نہیں ہیں بلکہ وہ صرف راستے کی سمت بتاتے ہیں۔ یہ فرائض ایک طرح کی لازمی تربیت ہیں جو ہم کو مخصوص وقتوں میں ایک مقررہ عمل کر کے اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ بقیہ وقت میں ہمیں کیا کرنا ہے۔ ان کی حیثیت محض علامات کی ہے نہ کہ ذمہ داریوں کے حدود متعین کرنے کی۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں جب ہندوستان میں چینی جارحیت کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا۔ احمد آباد کے ۲۵ ہزار طلبہ نے یہ عزم کیا کہ وہ ملک کے دفاع کے لیے لڑیں گے اور اپنی جان دے کر چینی حملہ کا مقابلہ کریں گے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ان میں سے ہر شخص نے ایک ایک پیسہ دے کر ۲۵ ہزار پیسے جمع کیے اور ان کو ہندوستانی وزیراعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ پیسے دیتے ہوئے انھوں نے وزیراعظم سے کہا کہ یہ ہماری طرف سے اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرنے To give ourselves to you کا نشان ہے۔ یہ وقت کی ایک مثال ہے جس سے ہم اسلامی فرائض کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ بندہ فرائض اور واجبات کی تسکین میں اپنے وجود کا تھوڑا حصہ خدا کو دے کر اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ اپنا پورا وجود خدا کو دینے کے لیے تیار ہے۔ وہ اپنی بعض خصلتوں میں سے کچھ دے کر تمام خصلتوں سے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔

اب نماز کو لیجیے جو اس سلسلے کی دوسری چیز ہے۔ جب کوئی شخص مکمل حوالگی کے ساتھ خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے بالکل قدرتی نتیجے کے طور پر اس کی پوری زندگی ذکر اور دعائیں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی ذکر اور دعا کی ایک مخصوص صورت کا نام نماز ہے۔ اہل ایمان کی تعریف قرآن میں سَيِّدُ مَوْفُورٍ رَافِعٌ خَوْفًا وَكَمَلًا (سورہ ۱۱۰) کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ یعنی وہ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمتوں کی تمنا کرتے ہوئے اسے پکارتے رہتے ہیں۔ جن واقعات کو دیکھ کر لوگ دوسری چیزوں کو یاد کرتے ہیں ان کو دیکھ کر مومن خدا کے تصور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کسی جنازے میں شرکت کے لیے قبرستان جاتا ہے تو یہ موقع اس کے لیے سچی کے لوگوں سے ملاقات کی تقریب نہیں ہوتی بلکہ کھودی جانے والی قبر اس کے لیے ایک کھلا ہوا دروازہ بن جاتی ہے جس سے وہ آخرت کی حقیقتوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اگر وہ کسی عالیشان مکان میں اپنے آپ کو پائے تو وہ اس کے نقش و نگار دیکھنے میں محو نہیں ہو جاتا بلکہ وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا مجھے ایسا مکان

نہیں چاہیے میں تو تیری رحمت اور مغفرت کا طلب گار ہوں اور وہی تو مجھے دے دے۔ اگر وہ کسی تاریکی کھنڈر کے سامنے کھڑا ہو تو وہ اس کو شخص آسمان قدیمہ کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ اس سے یہ عبرت حاصل کرتا ہے کہ ان آبادیوں کے بننے والے اپنی آبادیوں کو چھوڑ کر جس دنیا میں چلے گئے ہیں وہیں مجھ کو بھی جانا ہے۔ اگر وہ کسی جدید طرز کے کارخانے میں داخل ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جو کام پہلے سخت محنت کی انسانی محنت سے انجام پاتا تھا، اس کو تیز رفتاری سے انجام دے رہی ہیں اور انسان ان کے سامنے کھڑا ہو صرف ان کی کچھ بھال کر رہا ہے تو اس کو "معتنی انقلاب" کے عجائب یاد نہیں آتے بلکہ وہ کارخانے کی شکل میں خدا کے انعامات کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ پکاراٹھتا ہے کہ خدایا تو نے انسان کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جس کی اسے ضرورت تھی۔ تو نے اسے ایک ایسی کائنات دی ہے جو اپنے ساز و سامان کے ساتھ گویا اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ انسان اگر ایک مین دبا دے اور ساری کائنات اس کی خدمت کے لیے حرکت میں آجائے۔

اسی طرح وہ خود بھی غفلت سے بیدار ہوتا ہے کہ وہ بھی خدا کو اپنی طرف مائل کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کا ہر عمل اپنے رب سے درخواست ہے۔ جب وہ کسی کی عیب پوشی کرتا ہے تو گویا وہ خدا سے اس کا معافی مانگتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس کے عیبوں کو چھپائے۔ جب وہ کسی کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرتا ہے اور اس کے حق سے زیادہ اسے دیتا ہے تو درحقیقت وہ دعا کرتا ہے کہ مالک حقیقی اس کے ساتھ بھی اسی طرح فیاضی کا معاملہ کرے حتیٰ کہ جب وہ اپنے بچے کو گود میں لیتا ہے تو اس وقت بھی اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں بے احتیاجانہ آنسو آجاتے ہیں اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا یہ بچہ جتنا کمزور ہے میں اس سے زیادہ تیرے سامنے بے بس اور کمزور ہوں تو میری مدد فرما! وہ کہتا ہے کہ میرے رب! جس طرح ایک چھوٹا بچہ بہکتا ہے تو شیفتق باپ لپک کر اسے اٹھا لیتا ہے اسی طرح میں تیری طرف آنا چاہتا ہوں، مگر اپنے کمزور قدموں کے ساتھ میں تجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو ہاتھ فرما کر مجھے اٹھالے!

نماز درحقیقت اسی مومنانہ زندگی کا نشان اور اس کا مرکزی نقطہ ہے۔ مومن کی پوری زندگی نماز ہوتی ہے، مخصوص اوقات میں جب وہ نماز پڑھتا ہے تو گویا وہ اپنی حالت نماز میں ہونے کی حیثیت کو محکم اور مکمل کرتا ہے۔ نماز بندگی کی تصویر ہے۔ نماز اپنے رب سے قریب ہونے کی کوشش ہے۔ نماز خدا کے دربار میں حاضری کا وقت ہے۔ نماز ان جذبات کا ایک خارجی منظر ہے جو مومن کے سینے میں ٹھپ رہے ہوتے ہیں نماز ایک لحاظ سے دعا ہے، وہ اپنی عاجزی کو پیش کر کے خدا سے اس کی رحمت و مغفرت مانگتا ہے اور دوسرے لحاظ سے وہ اسی قسم کا ایک بیتا باطل ہے جو ایک شخص اپنے محبوب دوست کے لیے کرتا ہے جب کہ وہ اس سے بچہ نکلا ہو اور تصور کی دنیا میں اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نماز خدا کا اپنے بندے کی طرف آنا اور بندے کا اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔ بندہ جب نماز میں مشغول ہوتا ہے تو وہ دوسری تمام حالتوں کے مقابلے میں خدا سے زیادہ قریب ہوتا ہے چنانچہ نماز کے وقت اس کو ایک خاص طرح کی قربت کا احساس

ہوتا رہتا ہے مگر جوں ہی نماز پوری کر کے وہ سلام پھیرتا ہے اس کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی ایرکنڈنڈ عمارت سے لپکا یک باہر آگیا ہو۔ مختصر یہ کہ نماز وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے بندوں سے ملاقات کرتا ہے۔ جس طرح جنت کی زندگی کے بارے میں آتا ہے کہ جب جنتیوں کو خدا کا دیدار کرایا جائے گا تو وہ جنت کے بہترین آرام و عشرت بھول جائیں گے اور انھیں محسوس ہوگا کہ یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو انھیں نصیب ہوئی ہے۔ اسی طرح کیفیت سے بھرا ہوا ایک سجدہ، الیا سجدہ جس سے سر اٹھانے کا جی نہ چاہتا دنیا کی تمام نعمتوں سے زیادہ لذت ہے۔ ایسے سجدوں والی نماز ہی حقیقی معنوں میں نماز ہے اور جس کو ایسے سجدوں کی توفیق نہیں ہوئی وہ گو یا ابھی تک نماز سے آشنا ہی نہیں ہوا۔ ایسے شخص سے میں خدا کے رسول کی زبان میں کہوں گا: اَرْجِعْ نَفْسَكَ فَإِنَّكَ لَمْ تَهْتَلْ۔ (اجاؤ اور پھر سے نماز پڑھو کیونکہ تم نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی) حدیث میں نماز کو دین کا ستون کہا گیا ہے۔ یہ نماز کے تربیتی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ نماز مومن کی تربیت ہے۔ ایک طرف وہ آدمی کے اندر وہ خصوصیات پیدا کرتی ہے جن سے وہ دین کا حامل بن سکے۔ اور دوسری طرف وہ آدمی کو اس مقصد کے لیے تیار کرتی ہے کہ وہ حق کا علمدار بن کر دنیا کے سامنے کھڑا ہو۔ نماز کیہ دونوں فائدہ سورہ منزل کی ابتدائی آیتوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:-

يَا أَيُّهَا الْمَرْمِلُ ۚ نِمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۚ	۱۔ چادر اوڑھنے والے! راتوں میں
نَهَضْهُ ۚ وَأَنْقَضْ مِنْهُ قَلِيلًا ۚ أَوْ ذُرْغَلِيَّةَ	قیام کر تھڑے حصہ کو ختم کر کہیں آدھی رات یا
دُرَّتِلَ الْفَرَّانِ تَرْتِيلًا ۚ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ	اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور قرآن کو ٹھہر
قَوْلًا نَفِيًّا ۚ إِنَّ نَاسِيئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ	ٹھہر کر پڑھ۔ ہم تم پر ایک بھاری بات اتارنے والے
وَطَوَّاءُ قَوْمِيَّةً ۚ إِنَّ لَكَ فِي السَّمَاوَاتِ سُبْحًا	ہیں بے شک رات کو انھیں انفس کو خوب چلتا ہے
طَوِيلًا ۚ وَذِكْرَ اسْمِكَ رَبِّكَ وَقَبْلَ الْبَيْتِ	اور ایسی حالت میں جو بات نکلتی ہے وہ بھی بہت
تَبِيلًا ۚ	درست ہوتی ہے۔ دن کے وقت میں بھی قبولیت

ہوتی ہے اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور ہر طرف سے کٹ کر اسی کا ہو جا۔ (مزل ۱۰-۱۸)

ان آیات میں نماز کے ایک پہلو کو وطاً شدید کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے آدمی مقال اقوم (درست گنگام) کے قابل بنتا ہے اور اس کے دوسرے پہلو کو ذکر اسم رب کہا گیا ہے جس سے تَبِيلُ اِلَى اللّٰهِ (مذہب کی طرف کیسی) کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے اوپر حق کی تبلیغ کرنے کی جو ذمہ داری ہے وہ ایک نہایت گراں بار ذمہ داری ہے جس کو اوپر کے ٹکڑے میں قول ثقیل کہا گیا ہے۔ اس قول ثقیل کا بوجھ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زبردست ریاضتیں کر کے اپنے اندر وہ قوت پیدا کرے جس سے اس کا بوجھ اٹھانا آسان ہو جائے۔ اس ریاضت

کا طریقہ لمبی قرأت والی طویل نمازیں ہیں جن کا بہترین وقت رات کی منہائی ہے۔ رات میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ایک بڑا مشقت کا عمل ہے جس کو یہاں دلیاً شدید (بہت دردناک) کہا گیا ہے۔ اس دلیاً شدید کے ذریعہ میں اپنے نفس کو کھتا ہے اور اس حالت میں قرآن پڑھ کر اپنے ذہن کو صاف اور دل کو پاک کرتا ہے۔ اس طرح تربیت پاکر وہ انسان تیار ہوتا ہے جو اعلیٰ اخلاقی اوصاف رکھنے والا ہوا اور مثال اقوم کے ساتھ تبلیغ کا ذریعہ انجام دے سکے۔ رات کو خدا کے سامنے کھڑا ہونا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دن کو بندگان خدا کے سامنے کھڑا ہو، اور خدا کے کلام کے مطالعے اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بول سکے۔ نماز کا دوسرا پہلو ذکر اسم رب ہے جو متیل الی اللہ کی کیفیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یعنی خدا کی یاد میں اس قدر مشغول ہونا کہ ذہنی حیثیت سے آدمی ایسا ہو جائے گویا وہ دنیا سے کٹ کر خدا سے جو گیا ہے۔ یہ نماز صرف یاد کی شکل میں بھی ہوتی ہے جس کو قرآن میں ذکر کثیر کہا گیا ہے اور قیام وقعود اور رکوع وسجود کی شکل میں بھی جو نماز کی مخصوص صورت ہے۔ آدمی جب دن کے وقت اپنی مسئولیتوں میں خدا کو یاد کرتا رہتا ہے اور جب مخصوص اوقات کے آتے ہی وہ خدا کے حکم کی نیت میں سجدے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے تو اس کے ذریعے سے وہ اس بات کی تربیت حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مادی دنیا سے ہٹا کر روحانی دنیا کی طرف لے جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے اس کی دلچسپیوں سے اس قدر بے تعلق ہو جائے گویا کہ وہ خدا کا راہب بن گیا ہے۔ اس طرح ذکر اور نماز آدمی کو مادی آلائشوں سے پاک کر کے اس قابل بناتے ہیں کہ وہ دنیا کے اوپر آخرت کو ترجیح دے سکے۔ فانی دنیا کو چھوڑ کر باقی رہنے والی دنیا میں اپنا دل لگائے۔

خدا کی راہ میں نفس کو کچلے بغیر آدمی کے اندر وہ سوز پیدا نہیں ہو سکتا جو دعوت حق کی جان ہے اور نہ اس کے بغیر کسی کو موعظہ حسنہ کی وہ زبان حاصل ہو سکتی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ داعی کی زندگی سراپا اپنے نظریات کا مجسم بن گئی ہو۔ اس کے منہ سے جو الفاظ نکلیں وہ محض الفاظ نہ ہوں بلکہ اس کی اپنی زندگی ان کے اندر کھنچ آئی ہو۔ دعوت حق کے کام کے لیے علمی قابلیت کی ڈگریاں درکار نہیں ہیں بلکہ اس کے لیے ایسی زندگی کی ضرورت ہے جو اپنی ترجمان آپ ہو، جو بولنے سے پہلے بول رہی ہو، اس کو ایسے دل کی ضرورت ہے جو اس علم میں گھل رہا ہو کہ لوگ اپنے رب کو کھیل گئے ہیں۔ جو ساری فکر و دل کو چھوڑ کر اس فکر میں دیوانہ ہو جائے کہ کس طرح لوگوں کو جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے کی طرف لگایا جائے اور آدمی کے اندر ان خصوصیات کو پیدا کرنے والا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ نماز ہے، ایسی نماز جس میں مشغول ہو کر بندہ اپنے آپ کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ خدا سے جڑ جاتا ہے۔ یہ نماز داعی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ وہ نماز کو اپنی زندگی میں شامل کیے بغیر حق کا داعی بن سکتا ہے تو یہ شخص ایک غلط فہمی ہے اور جتنی جلد وہ اس غلط فہمی سے نکل آئے اچھا ہے۔

نماز کی اسی اہمیت کی بنا پر حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں تمام حال کے نام ایک مکتوب

روانہ کیا جس میں یہ درج تھا کہ:-

اِنَّ اَھَمَّ اَمُوْرٍ کِبْرُ عِنْدِی الصَّلٰوۃ
مَنْ حَفِظَهَا وَحَافِظٌ عَلَیْہَا حَفِظَ
دِیْنِہٖ وَمَنْ ضَیْعَ مَا فَتَرَ لِمَا سِوَاہَا
اَضِیْعَ۔ (مالک)

تمہارے مساللات میں سب سے اہم چیز میرے
نزدیک نماز ہے جو شخص نماز کی حفاظت کرے گا
اور اس پر قائم رہے گا وہ اپنے دین کو محفوظ رکھے گا
اور جو شخص نماز کو ضائع کر دے وہ دوسری چیزوں
کو اور زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔

قبري چڑجہاد ہے۔ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے جس طرز زندگی کو خود اختیار کیا ہے اسی کی طرف
دوسروں کو لانے کی کوشش کرے۔ دعوت حق اور جہاد دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک لفظ سے
اس کی نوعیت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے سے اس کی کیفیت کا۔ یا ان دونوں کے فرق کو ہم اس طرح
بھی بیان کر سکتے ہیں کہ دعوت اس کی ابتدا ہے اور جہاد اس کی انتہا۔ ایمان لانا دوسرے نظموں میں ایک حقیقت
کا اکتشاف ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے جب آدمی دوسروں کو آگاہ کرنا چاہے تو اسی کو جہاد کہتے ہیں۔ یہ جہاد ابتدا
زبان سے شروع ہوتا ہے۔ مگر اپنے آخری درجے میں کبھی داعی کو تلواریں کے سایے اور بھانسی کے تختے پر
کھڑے ہو کر حقیقت کا اعلان کرنا ہوتا ہے۔ جو ان تمام مراحل سے گزر کر اپنی ساری کوشش امر حق کے اعلان و اظہار
میں صرف کر دے، وہی مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔

اس جہاد میں نظائر دوسروں کے خلاف جدوجہد ہوتی ہے مگر حقیقتاً یہ خود اپنے ساتھ جدوجہد کرنا ہے
جو شخص اپنے آپ سے لڑنے کی طاقت رکھتا ہو وہی دوسروں سے لڑ سکتا ہے۔ جو اپنے آپ کو زیر کر کے دبی دوڑ
پر غالب آسکتا ہے۔ داعی اور مجاہد بننے کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی خود اپنی زندگی میں اس
چیز کو قائم کر چکا ہو جس کو وہ دوسروں کی زندگی میں قائم کرنے کے لیے اٹھتا ہے۔ وہ ان باتوں پر سب سے پہلے
خود ایمان لائے جن کو وہ دنیا کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہے۔ وہ خود اس چیز کے لیے تیاب ہو چکا ہو جس
کی طلب وہ دوسروں کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جو اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو جس کو وہ
نظموں کے ذریعہ دوسروں کو دکھانا چاہتا ہے۔ داعی کے سامنے ایک طرف اس کے مخاطب ہوتے ہیں دوسری طرف
وہ دنیا ہوتی ہے جس کے حالات اسے لوگوں کو بتانے ہوتے ہیں، اس لیے وہ انتہائی بلندی پر کھڑا ہوتا ہے تاکہ وہ
سامنے کی دنیا اور پیچھے کی دنیا دونوں کو دیکھ سکے۔ اپنی بات پر سب سے پناہ یقین اور خدا کے اوپر بے پناہ اعتماد یہی
دو چیزیں خدا کے لیے کوشش کرنے والوں کا سرمایہ ہیں۔ آپ حقیقی منوں میں داعی اسی وقت بن سکتے ہیں جب آپ
کا حال یہ ہو کہ آپ کی کسی غلط روش پر تنقید کریں تو درد کی شدت سے آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔ آپ کی
دعوتی تحریریں بازار سے خرید کی ہوئی روشتائی سے زلکھی گئی ہوں بلکہ اپنے خون سے تیار کی گئی ہوں جس میں
آپ نے خود اپنے کو بچھڑ دیا ہو۔ اسی طرح اگر آپ مقرر ہیں تو آپ کا حال یہ ہونا چاہیے کہ جب آپ ایٹم پر

تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو آپ کا دل بے قرار ہو جائے اور آپ اپنے رب سے عرض کریں کہ: خدایا! جو کچھ تو آخرت میں ان کے سامنے کھولے والا ہے اس کو میں دنیا میں ان کے سامنے کھولنا چاہتا ہوں۔ تو تجھے اس کی توفیق دے۔ جو شخص اس مقام سے بول کے وہی دراصل داعی بن سکتا ہے اور جس کے اندر یہ عمل نہ ہو اس کو جانا چاہیے کہ وہ بھی داعی بننے کے قابل نہیں ہوا ہے۔ اس کو دوسروں کی اصلاح کے لیے اٹھنے سے پہلے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔

لوگوں کو خدا کی طرف بلانا، دنیا میں نظام عدل قائم کرنا، شیطان اور طاغوت کے خلاف جنگ کرنا، یہ جہاد فی سبیل اللہ کے میدان ہیں۔ گزری جہاد فی سبیل اللہ کا مقصود و مطلوب نہیں ہے۔ جہاد اصل میں مومن کو مشکلات میں ڈال کر اس کا امتحان لینا ہے۔ اور اس کو ایک ایسا موقع فراہم کرنا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ارتقاء کے لئے حدود منازل طے کر سکے جس طرح انسان کے مادی وجود کو باقی رکھنے اور اس کو نشوونما دینے کے لیے زمین و آسمان کی بے شمار چیزیں درکار ہیں۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے روحانی ارتقاء کے لیے ایک وسیع میدان بلکہ پوری کائنات کی ضرورت ہے۔ نظام اسلاف کا قیام اسی پھیلے ہوئے پروگرام کا ایک جزو ہے جو سماجی زندگی کے ساتھ مومن کو کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے جہاد کی تکمیل یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا میں نظام حق قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں بلکہ جہاد کی تکمیل یہ ہے کہ آپ اپنی قوتوں کا آخری حصہ تک اس راہ میں صرف کر دیں۔ خدا کے یہاں جن لوگوں کا شمار انبیاء اور شہداء میں ہو گا ان میں ایسے بھی لوگ ہوں گے جو ساری جدوجہد کے باوجود وقت کی سوسائٹی کو بدل دینے میں کامیاب نہیں ہوئے اور ایسے بھی لوگ ہوں گے جن کے پیغام کو اتنی بڑی اکثریت نے قبول کر لیا کہ وہ سوسائٹی کا دین بن گیا۔ یہ دونوں قسم کے لوگ خدا کے نزدیک کامیاب لوگ ہیں۔ ان کے درمیان خدا کے یہاں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی بلکہ وہ سب کے سب یکساں اعزاز و احترام کے مستحق ہوں گے کیونکہ جذبہ کے نتیجے کا تعلق دوسروں سے ہے نہ کہ جذبہ جہاد کرنے والوں سے۔ جب خادم نے اپنا کام پورا کر لیا تو بہر حال وہ اپنی خدمت کا صلہ پانے کا مستحق ہو گیا۔ خواہ دوسرے لوگوں نے اس کی خدمت کو تسلیم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

اس جدوجہد کا پروگرام کیا ہے، اس کو جاننے کے لیے آپ کو درجہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ واقعہ کہ جو حقیقت آپ کے اندر منکشف ہوئی ہے آپ کے ماحول کے بے شمار لوگ اس سے ناواقف ہیں، بس یہی آپ کے پروگرام کو متعین کر دیتا ہے۔ اسلامی شعور حاصل ہونے کے بعد جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی امتحان کی زندگی ہے اور ہر شخص جنت یا جہنم کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو اُن کے والے دن سے ہوشیار کریں۔ ہمارا جہاد یہ ہے کہ خدا کے عذاب سے دور بھاگنے کے لیے اپنی ساری کوشش صرف کر دیں۔ مومن کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ حالات کے مطابق لوگوں کو ان کی دنیوی مشکلات سے نکلنے میں مدد دے۔ مگر زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ دنیوی مشکلات سے نجات پانا نہیں ہے بلکہ آخرت کے عذاب سے نجات پانا ہے۔ مومن کا اصل کام یہ ہے کہ اپنی کوششوں کو اس راہ میں صرف کرے۔ لوگوں کو جہنم سے بچانے کے لئے وہ اپنی ساری طاقت لگا دے۔

یہ دعویٰ جِد و جہد اور خدا کی راہ میں آخری جنگ بڑھنے کی اسی کوشش کا نام جہاد ہے جس کو حدیث میں "دین کی سب سے بلند چوٹی" کہا گیا ہے۔ جہاد اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ بندے کے لیے ایک ایسا میدان فراہم کیا جائے جہاں وہ اپنی تمام کوششوں کو خدا کی راہ میں لگا سکے۔ جہاد کی روح یہ ہے کہ بندہ اپنی کوششوں کو آخری جنگ صرف کر ڈالے تاکہ خدا اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر آخری جنگ لٹھ مارے جہاں تکلیفوں اور دشواریوں کے میدان میں اپنے خدا پرست ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ آدمی اکثر اپنی کوتاہیوں کے جواب میں دشواریوں کی ایک فہرست پیش کر دیتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی دشواریاں وہ قیمتی مواقع ہیں جن کے خلاف جِد و جہد کر کے آپ اپنے رب کو خوش کر سکتے ہیں۔ آپ جن ذاتی مسائل کی بنا پر اسلام کی طرف بڑھنے سے رک رہے ہیں، وہ دراصل آپ کے لیے ترقی کے ذریعے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں ہیں کہ آپ ان کو دیکھ کر رک جائیں۔ وہ اس لیے ہیں تاکہ آپ انھیں بھانڈ کر آگے بڑھ جائیں، خدا کے نزدیک اس کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی متناؤں کو اس کے لیے ذبح کر دے، جو اپنے آرام کو اس کی خاطر چھوڑ دے، جو اپنی مشکلات کو نظر انداز کر کے اس کی طرف چلا آئے، دنیا میں کسی شخص کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں کچھ حاصل کر لے۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دے۔ بنی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا: سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: "وہ شخص جو اپنی بہترین سواری لے کر نکلا اور میدان جنگ میں اس کا گھوڑا مارا گیا اور وہ خود بھی شہید ہو گیا۔" گویا سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جو بالکل لٹا ہوا اپنے رب کے پاس پہنچے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر انڈیل دے گا۔

محترم رفقا! یہ اجتماع جس میں آپ اس وقت شریک ہو رہے ہیں اس کی سب سے زیادہ قیمتی تعبیر میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ آپ کی طرف سے تجدید عہد ہے۔ آپ نے ہجرت میں شریک ہو کر پہلے دن اپنے رب سے جو معاہدہ کیا تھا، یہ اس معاہدہ پر آئندہ قائم رہنے کا عزم ہے جو آپ اپنے سیکڑوں رفقا کے سامنے کر رہے ہیں اور جس پر خدا اور اس کے فرشتے گواہ ہیں۔ اگر کھلی مدت میں آپ اپنے معاہدے کو پورا کرنے والے ثابت ہوئے ہوں۔ اگر آپ کے دن اور آپ کی راتیں اس بات کی شہادت دیتی ہوں کہ آپ اپنے معاہدے میں پورے اترے ہیں تو میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس تجدید عہد کا موقع ملنا آپ کے لیے آپ کے رب کی طرف سے خوش خبری ہے۔ یہ آپ کی کوششوں کے قبول کیے جانے کا نشان ہے۔ اور اگر آپ اپنے معاہدے کو پورا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں آپ کو یہاں آنے کی توفیق دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اس بات کا ایک اور موقع دیا گیا ہے کہ آپ اپنے معاہدے کی اہمیت کو سمجھیں اور جو کچھ پہلے نہیں کر سکتے اس کو آئندہ کرنے کا عزم لے کر یہاں سے واپس جائیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ہم کچھ کر سکتے ہیں اپنی موجودہ زندگی ہی میں کر سکتے ہیں اور اس زندگی کی مدت

بہت کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آج ہمیں دیکھ رہے ہیں ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کو دیکھنے کے لیے اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ ہم اپنی عمر پوری کر کے اپنے رب کے پاس جا چکے ہوں گے۔ ہماری موجودہ زندگی وہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے مستقبل کی تہیکے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ خاص سے پہلے ایسا کوئی موقع انسان کو ملا تھا اور نہ اس کے بعد ایسا کوئی موقع انسان کو ملے گا۔ ہم ایک ایسے امتحان سے گزر رہے ہیں جس کا ایک لازمی نتیجہ ہمارے سامنے آنے والا ہے اور بہت جلد ہم ایک ایسے لازمی نتیجے سے دوچار ہوں گے جس کے بعد کبھی تیاری کا موقع ہم کو نہیں ملے گا۔ زندگی کا ہر لمحہ جو آپ صرف کر رہے ہیں، خوب سمجھ لیجیے کہ آخری طور پر صرف کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ پھر واپس آنے والا نہیں ہے۔

خلا کا دین ہم سے ہماری زندگی مانگ رہا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنا پورا وجود اس کے سپرد کر دیں۔ ہمارے دل اور ہماری راتیں اس کے لیے وقف ہو جائیں اپنی طاقات کا آخری حصہ تک ہم اس کی راہ میں لگا دیں۔ جو لوگ اس سرفروشانہ جذبے کے ساتھ آگے بڑھیں اور جن کے اندر اپنے آپ کو قربان کر کے دین کی خدمت کرنے کا حوصلہ ہو، وہی دراصل دین کی خدمت کریں گے اور جن کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو۔ وہ صرف اپنی خدمت کر سکتے ہیں۔ خدا کے دین کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں۔ (ماہنامہ زندگی رام پور، ص ۱۲۸)

نوٹ: جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع بمقام دہلی میں کی گئی ایک تقریر، ۱۲ نومبر ۱۹۶۰ء

بامقصد زندگی

دوستو! ہم مسلمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم بامقصد لوگ ہیں۔ کیوں کہ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے۔ مگر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بامقصد ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ایک مقصدی تصور آپ کے ذہن میں پایا جا رہا ہو۔ کچھ تقریروں کو سن کر یا کچھ تحریروں کو دیکھ کر ایک مقصدی نظریہ کی کے داغ میں پھونچ جاتے تو صرف اس بنا پر اسکو بامقصد انسان نہیں کہا جاسکتا۔ بامقصد انسان تو وہی ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ بامقصد بن گیا ہو جس کی زندگی اس کے مقصد میں اس طرح ڈھل جاتے کہ دونوں کے درمیان کوئی دوئی باقی نہ رہے۔

آپ اس وقت ایک سبب میں بیٹھے ہیں جس کے اوپر اونچے اونچے مینار کھڑے ہیں اگر ہوا کے ذریعے کچھ آم کے پتے اڑ کر آئیں اور ان میناروں پر ایک جائیں تو اس بنا پر ان میناروں کو آپ آم کا درخت نہیں کہنے لگیں گے۔ آم کا درخت تو وہی ہے جو اپنی جڑ میں بھی آم ہو، اپنے تنہ میں بھی آم ہو، اپنی شاخوں میں بھی آم ہو، اپنے پتوں میں بھی آم ہو، اور وہ آم ہی کے پھل دے۔ آم کا درخت آپ اسی کو کہتے ہیں جو اس طرح اوپر سے نیچے تک آم ہو محض کسی لمبی کھڑی ہوئی چیمیز پر آم سے میٹھا بہت رکھنے والی کچھ چیزوں کا اتفاق سے جمع ہو جانا اس کو ہرگز آم نہیں بنا دیتا۔ اسی طرح آپ کو بھی بامقصد انسان کا لقب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب آپ سرے پاؤں تک اپنے پورے وجود میں بامقصد بن گئے ہوں۔ محض کچھ نظریات کا کہیں سے آکر آپ کے ذہن میں ایک جانا آپ کو بامقصد نہیں بنا دیتا۔ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے اور ہم اس وقت مسلمان کہے جانے کے مستحق ہیں جب ہم نے واقعی ایک مقصد کی طرح اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کیا ہو۔

بامقصد انسان کی پہچان کیا ہے۔ اس کو درجنوں پیرایہ سے بیان کیا جاسکتا ہے اس وقت میں اسکی چند خصوصیات کا مختصر طور پر ذکر کروں گا۔

۱۔ با مقصد آدمی کی پہلی پہچان وہ ہے جس کو میں ”ارمیکاز“ کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تمام فکری اور ذہنی قوتیں آپ کے مقصد میں مرکوز ہو جائیں۔ آپ کا سوچنا، آپ کا محنت کرنا، آپ کا گفت کرنا، سب کچھ آپ کے مقصد کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہوں۔ آپ کی کوئی چیز دوسری سمت بکھری ہوئی نہ ہو۔ جو تباہانے والوں کے یہاں آپ نے دیکھا ہو گا، کام کرتے کرتے ان کے پاس بہت سی کیلیں پھیل جاتی ہیں۔ اس وقت وہ یہ کرتے ہیں کہ مقناطیس کا ایک ٹکڑا لے کر وہاں پھرتے ہیں جس سے تمام بکھری ہوئی کیلیں کھینچ کھینچ کر اس سے چمٹ جاتی ہیں۔ اور پھر وہ اٹھا کر اسے خانے میں رکھ لیتے ہیں۔ اس مثال میں اگر مقناطیس کی جگہ آپ اپنے مقصد کو سمجھیں اور کیلیوں کے بجائے اپنے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کا تصور کریں تو زندگی اور مقصد کے درمیان تسلی کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقناطیس کے گرد لوہے کے ٹکڑے جس طرح ایک ایک کر کے اکٹھا ہو جاتے ہیں اور اس پاس کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہوتا جو اس سے آکر چمٹ نہ گیا ہو، اسی طرح آدمی کے مقصد کے گرد اس کے سارے دل اور سارے دماغ کو مرکوز ہو جانا چاہیے۔

یہاں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب میسر میاں آئے ان کو بازار کا کچھ کام تھا۔ بازار جا کر جب وہ لوٹے تو انھوں نے ایک واقعہ بتایا جس سے مجھے بڑی عبرت ہوئی۔ واقعہ بہت چھوٹا سا ہے مگر اس میں ہمارے لئے بڑی نصیحت ہے، انھوں نے کہا کہ میں ایک جگہ پہونچا جہاں سڑک کے کنارے بہت سے موچی اپنی اپنی دوکان لئے بیٹھے تھے۔ جب میں انکے پاس سے گذرا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص میرے جوتے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جس موچی کی نظر اٹھتی ہے وہ بس میرے جوتے پر اکر رک جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ موچی بھی اپنے مقصد میں کس قدر گرم ہیں۔ ان کو انسان صرف جوتے کی شکل میں نظر آتا ہے پھرے ہوئے بازار میں سینکڑوں انسان ان کے سامنے سے آتے جاتے ہیں۔ مگر انھیں ان انسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ان کو نظر اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ آئے جانے والے لوگ اپنے پاؤں میں ایک ایسی چیز پہنے ہوئے ہیں جس کی پالٹن کو کے یا جس کی مرمت کر کے وہ کچھ پیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ تو انسان ان کی نظر میں صرف ایک جوتا ہے اور یہ۔ اسی طرح با مقصد آدمی اپنے مقصد میں گرم رہتا ہے۔ اس کو ہر چیز میں صرف اپنا مقصد نظر آتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کو، ہر مسئلہ کو، ہر بات کو اپنے مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے مقصد کے تصور میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ دوسری چیزیں اسے بھولنے لگتی ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو بہت فصال آدمی ہیں جو کام بھی کرتے ہیں اس کو پوری طرح لگ کر کرتے ہیں ایک مرتبہ

میں ایک ایسے زمانے میں ان سے ملنے گیا جب وہ اپنا نیا مکان بنوانے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے پانچا میں ایک جگہ بہت سے لال لال دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ انھوں نے دیکھ کر کہا: ”مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ اس کے بعد انھوں نے پانچا اٹھا تو معلوم ہوا کہ کسی سخت چیز سے ٹکرانے کی وجہ سے ٹانگ میں ایک جگہ چوٹ لگ گئی ہے۔ چوٹ لگ کر خون بہا، کپڑے میں لگا، پھر خود بخود سوکھ کر بند ہو گیا۔ اور انھیں مطلق خبر نہیں ہوئی جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ اسی طرح اس میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایک اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں دوسری چیزیں اس کے ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ جہاں دوسری چیزیں اسے محسوس نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے جسمانی تقاضے بھی بعض اوقات اسے یاد نہیں رہتے۔

یہی وہ بات ہے جس کو میں نے ”ارتکاز“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بامقصد آدمی وہی ہے جس کو اپنے مقصد میں اس درجہ شغف اور انہماک ہو جائے۔ اس کے بغیر اپنے آپ کو بامقصد آدمیوں کی فہرست میں لکھنا، مقصد کے لفظ سے ایک طرح کا مذاق کرنا ہے۔

۲۔ بامقصد آدمی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے مطابق زندگی گزارتا ہو۔ مقصد کے مطابق عمل“ سے میں ایک خاص چیز مراد لے رہا ہوں جس کو آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک حکیم صاحب ہیں جو ایک دیہات میں دوا علاج کا کام کرتے ہیں وہ کوئی سند یافتہ طبیب نہیں ہیں نہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بس لوگوں کی صحبت اور تجربہ کی وجہ سے کچھ باتیں جان گئے ہیں اور اس کے مطابق کام کر رہے بلکہ اپنی محنت اور توجہ کی وجہ سے اپنے علاقہ میں اچھے خاصے متعارف بھی ہو گئے ہیں۔ ان کے گھر پر کچھ کھیتی باڑی کا کام بھی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ میں کھیتی کے موٹے کام مثلاً کھودنا، ہل چلانا وغیرہ اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا۔ آپ سمجھیں گے وہ شاید کوئی شیر والی پوشش آدمی ہونگے اور اپنی شیر والی کی عزت رکھنے کے لئے ایسے کاموں سے بچتے ہوں گے مگر ان کو ”شیر والی“ اور ”پتیلوں“ کی زندگی سے کوئی دل چسپی نہیں۔ وہ بالکل سیدھے سادے دیہاتی حکیم ہیں۔ کھیتی کے سخت کاموں سے الگ رہنے کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ اگر میں اس طرح کے کام کروں تو میرا ہاتھ سخت ہو جائے گا۔ انگلیوں کی کھال موٹی ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض کی ہنسن میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہ سکوں گا۔ نبض کی ضربیں ٹہلی ہوتی ہیں اور ان میں بہت نازک اور لطیف فرق ہوتے ہیں۔ ان کو محسوس کرنے کے لئے انگلیوں کا نرم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر انگلیاں ہل اور کدال پکڑتے پکڑتے سخت ہو جائیں، جیسا کہ اس طرح کا کام کرنے والوں کی ہوتی ہیں، تو وہ نبض کی ضربیں محسوس کرنے کے قابل نہیں رہیں گی۔

ہر مقصد اپنے اختیار کرنے والے سے کسی کا تقاضہ کرتا ہے۔ جو شخص بھی کسی مقصد کو

ایسے، ضروری ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی اور اپنی روزانہ کی سرگرمیوں کو اپنے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ رکھے۔ وہ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دے۔ با مقصد آدمی ایک باشعور آدمی ہوتا ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقتہً ایک مقصد اتر ا ہولہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے عملی حالات اور ایسے مشاغل کی طرف نہ لے جائے جہاں وہ اور اس کا مقصد الگ الگ ہو جائیں۔ جب وہ ویسا نہ کرے تو اس کے جیسا اپنے مقصد کے اعتبار سے اسے بن کر رہنا چاہیے۔

میں ایک ایسے مسلم خاندان کو جانتا ہوں جس کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ معقول طریقہ سے ایک سادہ زندگی گزار رہا تھا اور اسی کے ساتھ دین کے تقاضے بھی پورے کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی شادی ہوئی۔ اس کے مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ شادی کو اس طرح کرے کہ اس کی وجہ سے اس کے گھر میں معمول کے مطابق روزانہ چل رہی ہے اس میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ مگر اس نے پہلی غلطی یہ کی کہ شادی کے لئے ایک ایسے خاندان کا انتخاب کیا جس کا معیار زندگی اس کے مقابلے میں بڑھا ہوا تھا۔ پھر شادی بھی اس طرح کی جیسے عام دنیا دار لوگ اپنی شادیاں کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس کے گھر کا سارا سرمایہ شادی میں لگ گیا بلکہ وہ کافی مقروض بھی ہو گیا۔ اس کے پیچھے اس کا سارا کاروبار اچھڑ گیا۔ اگر صرف اتنا ہی نقصان ہوا ہوتا جب بھی قیمت تھا، کیوں کہ جس طرح مختلف قسم کے دستی مادے آدمی کے اوپر پڑتے ہیں اور پھر وہ منجھل جاتا ہے، اسی طرح وہ دباؤ منجھل جاتا۔ مگر شادی نے اس کو ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا۔ جس کا پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسی لڑکی کو اس نے جو کپڑے اور سامان دیئے اور سسرال سے اس کے لئے جو کپڑے وغیرہ آئے، اس کی وجہ سے شادی شدہ لڑکی کی پوشش اور رہن سہن کا معیار یکا یک بہت بڑھ گیا۔ اور جب گھر کی ایک لڑکی کا معیار بڑھا تو اسی کیساتھ دوسروں کا لحاظ کرنا ضروری تھا۔ پھر اسی کے ساتھ نئے نئے فرنیچر سے لدی ہوئی پوری ایک گاڑی بھی اس کے گھر آئی ان چیزوں کے نتیجہ میں اس کی گھریلو زندگی کا معیار بالکل مصنوعی طور پر یکا یک بدل گیا۔ اب ہر چیز میں پہلے سے زیادہ خرچ ہونے لگا۔ اس طرح ایک طرف پچھلے قرضوں کی ادائیگی اور دوسری طرف بڑھے ہوئے اخراجات کو پورا کرنا، ایسے دو پاٹ بن گئے جن کے نیچے اس کی زندگی پس کر رہ گئی، اس کا گھر دیکھتے دیکھتے یکا یک دینہ دار گھرانے سے ایک دنیا دار گھرانے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ میں نے کتنے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اسی طرح وہ اپنے دنیوی معاملات میں ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ بالآخر وہ انھیں گھسیٹ کر تباہی کے غار میں پہنچا دیتا

ہے جو شخص کسی مقصد کے لئے دنیا میں جینا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ بشعور زندگی گزارے۔ وہ اپنی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس مادی دنیا میں ہر وقت اس کا امکان ہے کہ آدمی ایسے بندھنوں میں اپنے آپ کو پھنسا لے جس کے بعد وہ بہ ظاہر زندہ نظر آتا ہو، مگر مقصد کے اعتبار سے اس نے خود کشی کر لی ہو۔ دنیا کی ناشی چیزوں میں دل چسپی مادی ساز و سامان کی کثرت، سطحی مشاغل میں پڑنا، غیر ضروری عادتوں میں اپنے کو ڈالنا، پست لطایح کا مطالعہ — یہ وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو مقصد سے دور کر دیتی ہیں، اس کے وقت کو غیر ضروری مشغولیتوں میں لگا دیتی ہیں، اس کے جذبات و احساسات کو مقصد کے بائے میں کز دور کر کے دوسری چیزوں کے بارے میں شدید کر دیتی ہیں۔ اس کو ایسے تعلقات اور ایسے تقاضوں میں الجھا دیتی ہیں کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود دوسری طرف کھینچا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کو اسلام عزیز ہے اور آپ اس کو اپنا مقصد بنا کر اسی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنے کا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے لازم ہے کہ اپنی علی زندگی، اپنے تعلقات اور اپنی روزانہ کی مصروفیتوں کو اس سے ہم آہنگ رکھیں، آپ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دیں۔ اس معاملے میں آپ کو اس ہوشیار طبیب کی طرح بن جانا چاہیے جو اپنی آنکھوں تک کی اس حیثیت سے حفاظت کرتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے دوچار نہ ہوں کہ وہ نبض دیکھنے کی صلاحیت کو کھو دیں پھر ایک مسلمان کا مقصد اس سے زیادہ نازک اور اس سے زیادہ مشکل ہے، اس لئے آپ کو اس سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اپنی حرکات پر نظر رکھنی چاہیے۔

۳۔ تیسری چیز بامقصد آدمی کو پہچاننے کی یہ ہے کہ اس کے عمل میں مقصد کی روح موجود ہو۔ یہاں ”عمل“ سے میری مراد عام عمل نہیں ہے، بلکہ وہ عمل ہے جو مقصد کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ تعجب نہ کریں۔ مقصد سے متعلق عمل بھی کبھی بے مقصد ہوتا ہے۔ بہ ظاہر آدمی مقصد کا سائل کر رہا ہوتا ہے، مگر حقیقتاً اس کے عمل کا مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک مثال لیجئے۔ ہمارے یہاں جو مذہبی فرقے ہیں ان کی ابتدا بھی اصل ایک مقصدی گردہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ وہ ایک مخصوص مشن لے کر اٹھے تھے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ آج وہ اپنی مقصدی حیثیت کو کھو چکے ہیں۔ وہ تحریک کے بجائے ایک جامد قسم کی ردائی انجمن بن کر رہ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا مقصدی تصور ان کے ذہن سے نکل گیا، اور نہ ایسا ہے کہ مقصد کے لئے کام کرنا انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب چیزیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ مگر ان میں اب وہ اسپرٹ باقی نہیں رہی جو ایک مشن کے علم بردار کے اندر ہوتی ہے۔

اب ان کا مقصد محض ایک بحث و گفتگو کا موضوع ہے جس پر وہ کبھی آپس میں کبھی دوسروں سے باتیں کر لیتے ہیں۔ ان کے رسالے اور اخبار نکلتے ہیں۔ مگر ان رسالوں اور اخباروں کی حیثیت مقصدی پرچوں سے زیادہ کاروباری اداروں کی ہے۔ ان کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان اجتماعات کی حیثیت کسی مقصدی سرگرمی کی نہیں۔ بلکہ وہ ماضی کی پڑی ہوئی ایک ٹیکر ہے جس پر وہ رسمی طور پر چلے جا رہے ہیں۔ ان کے جماعتی فنڈ بھی ہیں جن میں وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ دیتے ہیں۔ مگر یہ دنیا زیادہ تر جماعتی تقاضے کے تحت ہوتا ہے نہ کہ حقیقتہً انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے کے تحت۔ وہ اپنے خیالات کو پھیلانے کے لئے دورے اور تقریریں کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کسی مقصدی بے تالی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یا تو محض روایتی ذوق کا اظہار ہوتا ہے یا اسی قسم کے جذبے کے تحت ہوتا ہے جیسے کسی فرم کی سببٹی برانچ کا انفرینٹی ڈیویڈنڈ انعام دینے کے لئے کیا کرتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات پر کتابیں اور پمفلٹ چھاپتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ ایک بنے ہوئے معلقہ کی مانگ پوری کر دی جائے۔

وہ مسن جو حقیقتہً داعیانہ جذبے کے تحت نکلتا ہے اور وہ عمل جو روایتی طور پر یا محض ڈیویڈنڈ انعام دینے کے لئے کیا جاتا ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک حقیقت ہے اور دوسرا حقیقت کی نقل۔ ایک جگہ بات صرف حلق سے نکلتی ہے اور دوسری صورت میں آدمی جب بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی پوری شخصیت کو انڈیل دیا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کا عمل صرف ایک لگی بندھی کارروائی نظر آتا ہے، اور دوسری صورت میں اس کا عمل اس کے بے تاب جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کی تمام زندگی سراپا اس کے مقصد میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری صورت میں بعض مقصد نما اجزاء اس کی غیر متعلق زندگی کے ساتھ اس طرح ادھر ادھر اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کسی مینار میں آم کے چند پتے۔ یہ خطہ ہر اس گروہ کو ہے جو ایک مقصد کو لیکر اٹھے اور اس پر اس کو پچیس پچاس سال گزر جائیں۔ لیکن یاد رکھیے کوئی گروہ اسی وقت تک مقصدی گروہ ہے جب تک حقیقتہً وہ مقصدی تڑپ کے تحت کام کر رہا ہو۔ اس کے بعد جب اس کی ٹھاطری اس سے اتر کر روایتی ڈگر پر چل پڑے، جب اس کی سرگرمیاں بے تابانہ جذبات کے اظہار کے بجائے مقررہ کارروائی بن کر رہ جائیں، تو وہ تحریک کے بجائے رسم اور جماعت کے بجائے انجمن بن جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ شکلاً وہ ایک با مقصد گروہ کے مانند نظر آتا ہے۔ مگر مقصدی حیثیت سے اب اس پر موت وارد ہو چکی ہوتی ہے۔

وہ بمقصد انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ سابقہ بمقصد انسان کی لاش ہوتی ہے جو دیکھنے میں سابقہ انسان کی طرح نظر آتی ہے، مگر حقیقتہً انسان نہیں ہوتی۔ اللہ کو چیز مطلوب ہے وہ کوئی رسمی ڈھانچہ یا کوئی تنظیمی کارگزاری نہیں ہے۔ ایسے ڈھانچہ یا کارگزاری کا نمونہ تو مثینی انسان بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اللہ کو ہمارے زندہ شعور اور ہمارے بیدار ارادہ کا نذرانہ مطلوب ہے۔ اللہ کو ہمارے عمل کا تقویٰ پہنچانا ہے نہ عمل کے ظاہری ہنگامے۔ عمل کے دوران ہم اپنے شعور کو جس طرح متحرک کرتے ہیں، ہماری نفسیات میں جو اندرونی بچل پیدا ہوتی ہے، عمل کرتے ہوئے ہمارے قلب و روح کو جو حیاتی غذا ملتی ہے وہی ہمارا اصل حاصل ہے جب مقصدیت زندہ ہو تو آدمی کا عمل ایک زندہ عمل ہوتا ہے اور جب مقصدیت مرجاتی ہے تو عمل ایک بے روح کارروائی بن کر رہ جاتا ہے۔ آدمی حرکت کرتا ہے مگر اس کی روح پر جمود طاری رہتا ہے۔ آدمی ظاہری کارنامے دکھاتا ہے مگر آدمی کا اندرونی وجود اس طرح سویا رہتا ہے جیسے اس پر نیند طاری ہو گئی ہو۔ آدمی اوپر سے زندہ دکھائی دیتا ہے مگر اندر سے وہ ایک مرا ہوا انسان ہوتا ہے۔

اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کروں گا۔ اس طرح کی باتیں جب کہی جاتی ہیں تو بعض لوگ جواب دیتے ہیں۔ ”آپ کی باتیں تو سب ٹھیک ہیں، ہم خود بھی اپنے اندر یہی چیز پیدا کرنا چاہتے ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چیز کیسے پیدا ہو۔“ یہ بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقتہً اس کے ذریعے سے اپنے الزام کو اپنے سے ہٹا کر اسے خارج کے اوپر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر سوچئے کہ وہ خارج جس کے اوپر آپ اپنا الزام ڈالنا چاہتے ہیں وہ کوئی ظاہر ہے کہ وہ اس دنیا کا مالک خدا ہے۔ اسی نے ساری چیزوں کو بنایا ہے۔ اس نے خارج کو الزام دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا اس ڈھنگ سے بنائی ہے کہ ہم دہاں اپنے ایمانی تقاضوں کو حاصل کرنا چاہیں تو محال نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ خدا ص سے پاک ہے کہ اس پر یا اس کی تخلیق پر اس قسم کا الزام عائد ہو سکے۔ اس لئے خارج پر جب الزام ڈالنا نہیں جاسکتا تو احتمالہً وہ آپ کی طرف لوٹے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اپنی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا ہو۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ فطرت اور حقیقت میں تضاد نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ ہم کو ایسا ہی بننا چاہیے تو لازماً ہماری فطرت اور کائنات کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہم ایسے بن سکیں۔

اس لئے ہر خرابی کا سبب اپنے اندر ڈھونڈئے کیوں کہ آپ کے باہر حقیقت کوئی چیز ہی نہیں ہے جہاں یہ اسباب پائے جا رہے ہوں (الفرقان محرم ۸۴ ۱۳۸۵ھ)

(جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے ایک اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ۱۹۶۳ء)

یہ بے حسی کیوں

مجھ کو جب یہ حکم ملا کہ اس وقت کی مجلس میں مجھے کچھ کہنا ہے، تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے آپ سے کہنی چاہئے۔ یہ چونکہ فصاحت، یا قرآن کے الفاظ میں کو حسی باخفی اور تو حسی بالصبر کی مجلس ہے، اس لئے اس مناسبت سے بہت سی باتیں ذہن میں آئیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سوال نے میرے سلسلہ خیال کو توڑ دیا۔ ”تم جو باتیں سوچ رہے ہو کیا وہ سننے والوں کے لئے نئی ہیں، کیا ان کے کان بار بار یہ دوازیں نہیں سن چکے ہیں۔ پھر جن الفاظ نے اس سے پہلے کوئی اثر نہیں دکھایا، وہی الفاظ ایک مرتبہ اور دہرا دینے سے کیا انقلاب آجائے گا؟ اس سوال کا آنا تھا کہ میرے سارے خیالات اس طرح منتشر ہو گئے جیسے یکایک ہوا کا تیز جھونکا آئے اور ٹکڑوں اور پتوں کے ڈھیر کو اڑا لے جائے۔

اب میں دم بخود تھا۔ ”آخر اس بے حسی کی وجہ کیا ہے“ یہ سوال میرے سامنے گھونٹے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ساری باتیں کہہ ڈالی ہیں اور اب میرے پاس آپ سے کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میری مثال اس مقرر کی سی ہو گئی جو اپنی پوری تقریر ختم کر چکا ہو۔ مگر ساری قوت صرف کرنے کے بعد آخر میں جب وہ حاضرین سے کہنے کے لگائے فحرو ”انقلاب زندہ باد“ تو سامنے بیٹھے ہوئے ہزاروں انسانوں میں سے کسی ایک کی زبان بھی حرکت میں نہ آئے۔ وہ بار بار کہنے کے ”لگائے فحرو“ مگر ہر شخص اس طرح خاموش بیٹھا ہے گویا کسی کے صفحہ میں زبان ہی نہیں ہے۔ عین اس وقت مجھے دوسرے ایک آواز سنائی دی۔ مجھے نظر آیا کہ امام ترمذی سے لے کر کعب بن عیاض تک انسانوں کی ایک جماعت ایک دوسرے کو پکار رہی ہے کہ آخری رسول کا یہ پیغام اس بندہ خدا تک پہنچا دو، کیوں کہ اسی پیغام میں اس کے سوال کا جواب ہے:

احمد ثنا احمد بن منیع نا الحسن بن سوادنا	امام ترمذی سے کہا احمد بن منیع نے، ان سے کہا حسن بن سوار
لیث بن سعد عن معاویہ بن صالح عن عبد	نے، ان سے کہا لیث بن سعد نے، ان سے کہا معاویہ بن
الرحمن بن جبیر بن نقیر حدیث عن ابیہ عن	صالح نے، ان سے کہا عبد الرحمن بن جبیر نے، ان سے کہا
کعب بن عیاض قال سمعتُ ابا عبد اللہ علیہ	ان کے باپ نے، ان سے بیان کیا کعب بن عیاض نے،
وسلم یقول: ان لكل امة فتنة وفتنة اہمى	انھوں نے کہا کہ میں نے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے،
المال (ترمذی، ابواب الزہد)	آپ نے فرمایا۔ ہر امت کا ایک فتنہ تھا اور میری امت
	کے لئے جو بڑی فتنہ بنے گی وہ مال ہے۔

اس فقرے میں ”مال“، دراصل ”دنیا“ کا قائم مقام ہے۔ کیوں کہ دنیا کی وہ تمام چیزیں جن کو عاجلہ پسند انسان لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے وہ مال ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ مال دنیا کے سارے سامان کی قیمت ہے۔ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، یہی دنیا ہر زمانے میں انسانوں کی گمراہی کا سبب رہی ہے۔ مگر بعد کے دور

میں یہ فتنہ پوری شدت سے ظاہر ہونے والا تھا۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خاص طور پر امت اسلامیہ کا فتنہ قرار دیا۔ پہلے آدمی جن لذائذ و نعم کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وہ آج سامنی تحقیقات کے نتیجہ میں واقعہ بن کر انسان کو حاصل ہو چکی ہیں۔ یہی نہیں، پہلے دنیا کی جو رنگینیاں اور اس کے دل کش ساز و سامان صرف کسی بادشاہ کے محل میں ہوتے تھے، وہ آج خوب صورت الماریوں میں بچے ہوئے بازار کے اندر نظر آتے ہیں، وہ آج در و دیوار پر رنگین استہارات کی صورت میں لگے ہوئے ہیں، وہ پوری رعنائی کے ساتھ سڑکوں پر ظاہر ہو کر ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا اس سے پہلے بھی اتنی حسین نہیں تھی، اس لئے وہ اس سے پہلے انسان کے لئے اتنا بڑا فتنہ بھی نہیں بن سکتی تھی۔

یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر کر دوں گا جو ابھی حال میں اخبارات میں آیا تھا۔ نئی دہلی میں ہندوستان کے بین الاقوامی صنعتی میلہ میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر کار کی نمائش کی گئی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمین پر بھی چلتی ہے اور ساڑھ فیل کی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بھی اڑ سکتی ہے۔ اس عجیب و غریب کار کو جب ایک نوجوان سادھو نے دیکھا تو اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ”کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیٰ کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈوں“ سادھو نے کہا۔ گہرے کپڑے میں بیوس اور لمبے بھرے ہوئے بالوں والا یہ ہندوستانی نوجوان میں منٹ تک اس امر کی کار کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے مستقبل کی کار Car of the Future کا نام دیا ہے جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا ”اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھوں“ (ہندستان ٹائمز ۲۰ نومبر ۱۹۸۱ء) یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مادی ساز و سامان نے آج کس طرح ہر شخص کو اس خطرے میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ ان کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر زندگی کی اصل حقیقت کو بھول جائے۔

اس حدیث سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ امت محمدیہ کے افراد میں جب کوئی کمزوری نظر آئے تو اس کے اسباب سب سے پہلے دنیا کے فتنوں میں تلاش کرنے چاہئیں۔ جب اس امت کا فتنہ دنیا ہے تو امت کی خرابیاں بھی دنیا ہی کی پیدا کی ہوئی ہوں گی۔ جب میں نے اس حیثیت سے غور کیا تو بالآخر میرا ذہن اس پر مطمئن ہو گیا کہ دنیا ہی وہ سب سے بڑا روک ہے جو حق کی آواز کو آدمی کے لئے مقابل فہم اور قابل قبول بننے نہیں دیتا۔ اسلام کی بلند تر حقیقتوں کو دہی شخص پاسکتا ہے جو دنیا اور دنیا کی چیزوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھا چکا ہو۔ جو اس سے اوپر نہ اٹھ سکے اس کے عین سر کے اوپر حقیقت کی آواز گونج رہی ہو گی مگر اس کو گرفت کرنے کی طاقت سے وہ محروم ہو گا۔ اس کے پاس وہ کان نہیں ہوں گے جن سے وہ سنے اور وہ دل نہیں ہو گا جن سے وہ اسے سمجھے آپ کی سعادت و ترقی کے تمام امکانات اس وقت تک آپ سے دور ہیں جب تک آپ کی توجہات دنیا کے اندر گھری ہوئی ہوں۔ آپ کا مومن بننا، آپ کا داعی بننا، آپ کا مجاہد فی سبیل اللہ بننا، سب کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس

سے پہلے آپ ”زهد فی الدنیا“ کی کیفیت اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں جو رسول کے الفاظ میں — اول صلاح
 ہذا کا الامتہ ہے۔ دنیا پسندی دوسرے نفلوں میں ظاہر پسندی کا نام ہے۔ اور زهد یہ ہے کہ ظاہری چیزوں
 کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے وہ آدمی کے سامنے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا پسندی سطحیت پیدا کرتی ہے اور زهد
 سے وہ گہری نظر حاصل ہوتی ہے جو چھپے ہوئے واقعات کو باطل بے نقاب دیکھ لے۔ اور حقیقت سے انتہائی حد تک
 آشنا ہو کر بولی سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

ما زهد عبدٌ فی الدنیا الا نبت اللہ الحکمة
 فی قلبہ واطلق بہا لسانہ وبعیث الیہ عیب الدنیا
 وداء ہا و دواء ہا و اخذ حجہ سالما الی دار
 السلام (زیہقی فی شعب الایمان)

جو شخص دنیا سے بے رغبت ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے
 دل میں حکمت پیدا کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر کلمات
 حکمت جاری کر دیتا ہے۔ دنیا کے عیب اور اس کا مرض
 اور علاج اسے دکھا دیتا ہے۔ اور اس کو سلامتی کے گھر
 (جنت) تک محفوظ لے جاتا ہے۔

یہ حکمت جو زہد کے صلے میں ملتی ہے، یہ خدا کی سب سے بڑی دین ہے جس کو قرآن میں ”خیر کثیر“ کہا گیا ہے
 یعنی سب سے بڑا خزانہ۔ قرآن کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمت کا خزانہ اسی کو ملتا ہے جو دوسرے
 خزانوں سے اپنی نظرس ہٹا لے، جو دنیا کی محبت سے اپنے دل کو خالی کر چکا ہو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں خدا کی راہ
 میں خرچ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے :

یؤتی الحکمة من یشاء ومن یؤتی الحکمة
 فقد ادتی خیرا کثیرا

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ”خیر کثیر“ اسی کو ملتا ہے جو ”خیر قلیل“ سے اپنے آپ کو خالی کر لے، جو خیر
 قلیل میں پٹا ہوا ہو، وہ خیر کثیر سے اپنا دامن نہیں بھر سکتا۔

میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں اسی گمراہی دنیا کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ کیوں کہ اپنے مطالعہ اور تجربہ
 سے میں اس حقیقت پر مطمئن ہو چکا ہوں کہ جب تک کسی کے اندر زہد کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ دین کی اعلیٰ حقیقتوں کا
 ادراک نہیں کر سکتا اور نہ اس کے اندر بھی گہرا عمل پیدا ہو سکتا۔ جس شخص کی آخرت طلبی نے اس کو دنیا کا زائد نہیں
 بنایا، اس کے درمیان اور قرآن کے درمیان ایک ”جھاپ مستور“ حائل رہتا ہے۔ وہ سنتا ہے مگر نہیں سنتا ،
 وہ سنتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔ (بہارِ اسماعیل ۴۶-۴۵)

زہد فی الدنیا کے معنی ہیں دنیا سے بے رغبتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے دل جیسی کا قلع ختم کر کے
 اس سے صرف ضرورت کا تعلق باقی رکھا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں العتقا میں من دار الضرور کہا
 گیا ہے۔ (دھوکا دینے والی جگہ سے دور رہنا) اس دوری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا کے کاروبار سے

الگ تھلک ہو جائیں۔ زہد دراصل دنیا سے حیاتی بے تعلقی کا نام ہے نہ کہ عملی بے تعلقی کا۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا، زہد خراب کپڑے اور معمولی کھانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے جو دل کے اندر پیدا ہوتی ہے ظاہری شکلیں اس اندرونی کیفیت کا فطری اظہار ہیں، نہ کہ بجائے خود کسی ظاہری شکل کا نام زہد ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص جھوٹی پٹری میں رہتا ہو مگر اپنے خیالات و احساسات کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ایک دنیا پسند آدمی ہو۔ اور دوسرا شخص اپنے آپ کو عالی شان عمارتوں کے درمیان پائے مگر دنیا پسندی سے اس کا ذہن خالی ہو زہد کسی مصنوعی تدبیر کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ آدمی کی ایمانی حالت کا ایک فطری اظہار ہے۔ جب کوئی شخص اعلیٰ حقیقتوں کو پالیتا ہے تو اسفل حقیقتیں خود بخود اس کی نگاہ میں حقیر بن جاتی ہیں۔ خودی قدر دل کی اہمیت کا احساس ذہنی قدرتوں کو غیر اہم بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی ایمانی کیفیت کے بالکل لازمی نتیجے کے طور پر دنیا سے بے رغبت ہو جاتا ہے۔ جب آپ کا ذہن خدا کی باتیں سوچنے میں اتنا مصروف ہو کہ آپ دنیا کی باتیں بھولنے لگیں، جب آخرت کی فکر آپ کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ دنیا کے غم آپ کو یاد نہ آئیں، جب آنے والے مستقل آرام و تکلیف کا مسئلہ آپ کو اتنا فکر مند بنا دے کہ عارضی آرام و تکلیف کے مسئلے آپ کے لئے بے حقیقت ہو جائیں۔ جب کل کی زندگی آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ آج کی زندگی کے بارے میں آپ لوگوں کو غافل نظر کرنے لگیں، جب بلند تر حقائق کی طرف متوجہ ہونے کی دہر سے آپ دنیا میں اس طرح رہنے لگیں گویا آپ دنیا میں نہیں ہیں۔ جب دنیا میں آپ کوئی آرام دیکھیں تو یہ سوچ کر رو پڑیں کہ معلوم نہیں کہ آخرت میں کیا ہونے والا ہے اور جب کوئی تکلیف ستائے تو آپ کی زبان سے نکلے کہ ”خدا یا دنیا کی معمولی تکلیف کا یہ حال ہے تو آخرت میں کیا ہوگا“ جب دنیا کی لذتیں آپ کو تسکین نہ دے سکیں اور دنیا کی زہمتیں آپ کی نگاہ میں حقیر بن جائیں — جب آپ کا حال یہ ہو جائے تو اسی کا نام زہد فی الدین ہے۔ آنحضرت نے ایک بار اپنے صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو پوچھا کہ جو نصیحت فرمائی تھی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

عَدَّ نَفْسًا مِّنْ أَهْلِ الْقُبُورِ (بخاری) اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو گویا اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو دنیا میں بھیجا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یہاں کی نعمتوں میں غرق ہوں اور یہاں رہ کر اپنے دل کی تمنائیں پوری کریں۔ بلکہ وہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں سے کون ہے جو دنیا کو اپنے حوصلوں اور تمنائوں کا قبرستان بناتا ہے۔

اس تشبیہ سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زہد صرف محرمات دنیا سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی حالت ہے جس میں آدمی کو بہت سی جائز چیزوں سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لینا پڑتا ہے۔ بے شک جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے وہی حرام ہے اور جو کچھ اس نے حلال کیا ہے وہ سب حلال ہے۔ کسی انسان کو حق نہیں کہ اس میں بال برابر کوئی رد و بدل کر سکے۔ مگر شریعت کی قانونی حدود و ہمارے ارتقا کی آخری حدود نہیں ہے۔ دائرہ ایمان میں داخل ہونے کے لئے یقیناً صرف اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی احکام کے قانونی تقاضے پورے کر دے۔ مگر ایمان کے اعلیٰ

مراتب کو حاصل کرنے کا ذریعہ قانون نہیں، قربانی ہے، اگر آپ خدا کی راہ میں مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں تو آپ کو اپنی نیند، اپنا آرام، اپنی لذتیں، سب کچھ چھوڑنی پڑے گی، ذوق اور عادت کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا ہوگا۔ حالانکہ یہ سب کچھ آپ کے لئے جائز ہے اور ان میں سے کوئی بھی چیز شریعت نے حرام نہیں قرار دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام ماہوں کی طرح اسلام کی راہ میں بھی ترقی صرف اسی کے لئے ہے جو قانونی تقاضوں سے بلند ہو کر کام کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو یہ نہ دیکھتا ہو کہ دنیا کی چراگاہ میں اس کے لئے کیا کیا جائز ہے بلکہ جس کی نگاہ اس پر لگی ہوئی ہو کہ کتنے عظیم امتحان میں اسے پیش ہوتا ہے اور اس کے لئے کتنی بے پناہ تیاریوں کی ضرورت ہے۔ ایسا شخص یقیناً بہت سی ایسی چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائے گا جو اس کے لئے شرعاً حلال تھیں۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا یبلغ العبد ان یكون من المتقین کوئی شخص متقیوں میں شمار کئے جانے کے قابل نہیں ہو سکتا حتیٰ یدع مالا یا سبہ حدّاً لہا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ ان چیزوں کو بے باس (ترمذی، ابن ماجہ) چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ہے ایسی چیزوں سے بچنے کی خاطر جن میں داغ و آفتاب حرج ہے۔

اس "چھوڑنے" کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ ہوں۔ دوسرے، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ نہ ہوں مگر ان کے متعلق یہ شبہ ہو کہ وہ آدمی کو غلط انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔ پہلی صورت میں متعلقہ چیز کی حرمت کا یقین کو نہیں ہوتا مگر اس کی حلت کے بارے میں بھی ذہن پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس لئے آدمی احتیاط کی بنا پر اسے ترک کر دیتا ہے۔ دوسری صورت میں متعلقہ چیز اصلاً باطل جائز ہوتی ہے مگر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے نتائج پیدا کرے گی جو صحیح نہ ہوں۔ مثلاً دنیا کا عیش و آرام فی نفسہ باطل جائز ہے۔ مگر ایک محاسنِ مومن اس سے صرف اس لئے بچتا ہے کہ وہ ڈرتا ہے کہ اس میں چکر اس کا نفس موٹا ہو جائے گا۔ اس کے درمیان اپنے آپ کو باکروہ اور اس کے اہل فائدان غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہو جائیں گے، دنیا کی آسودہ زندگی "کامیابی" کا غلط احساس پیدا کرے گی اور اس طرح آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کی فکر نفسیاتی طور پر مضحل ہو جائے گی۔

نہد فی الدنیا سے وہ انسان کیسے بنتا ہے جو ترقی کے اعلیٰ مراتب طے کر سکے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، میں یہاں چند خاص پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ نہد فی الدنیا سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان میں پہلی چیز وہ ہے جس کو میں استغراق یا ذہنی یک سوئی کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ دنیا سے جتنا زیادہ آپ کا تعلق ہوگا اتنی زیادہ آپ کے خیالات منتشر ہوں گے، اللہ سے تعلق جتنا کم ہوگا اتنا ہی آپ اپنے خیالات کو یک جا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ حقیقت ایک نہایت لطیف چیز ہے اس لئے اس کو گرفت کرنے کے لئے غیر معمولی ذہنی اترکاز بہت ضروری ہے جس نے اپنی فکر کو مختلف سمتوں میں پھیلنا

رکھا ہو وہ ہرگز اعلیٰ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔ تاریخ سائنس کا عظیم ترین نام ”نیوٹن“ اپنے جیسے جو عظمت رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا راز نیوٹن کا ذہنی استغراق تھا۔ وہ اپنے چمپن میں Wool Gatherer کہا جاتا تھا۔ یعنی کھویا ہوا شخص۔ لوگ اسے نیوٹن کا طبعی نقص سمجھتے تھے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ اس کی یہ کیفیت اس کی استغراقی صلاحیت کی وجہ سے تھی۔ وہ کسی مسئلہ خاص پر ذہن کو باطنی مرکز کر کے سوچنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔ اپنی خصوصیت کی وجہ سے وہ بہت جلد مسائل کی تک پہنچ جاتا تھا۔ اور انتہائی پیچیدہ سوالات جن کے حل کرنے میں دوسرے لوگ مہینوں لگا دیتے تھے وہ انہیں گھنٹوں میں حل کر کے رکھ دیتا تھا۔

اگر آپ اس کے کہے میں داخل ہوں تو آپ کے سامنے کتابوں اور کاغذات کی ایک بے ترتیب دنیا ہوگی جس میں کسی اہتمام کے بغیر ایک شخص اس طرح کھڑا بیٹھا ہو نظر آئے گا جیسے وہ کوئی مجسمہ ہے جو کسی اسکیم کے بغیر اس دھیر میں لاکر ڈال دیا گیا ہے۔ مشہور سائنس دان اڈمنڈ ہلی Edmund Halley جس کے نام پر ایک مدار ستارہ ہلی کا مڑے Halley Comet کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ مدار ستارہ معلوم تو کر لیا تھا مگر اس کے مدار کا حساب لگانے میں وہ کوشش کے باوجود ناکام رہا۔ اس سلسلے میں مدد لینے کے لئے وہ نیوٹن کے پاس گیا۔ وہاں یہ سن کر اسے سخت حیرت ہوئی کہ اچھے ہوئے بالوں والا یہ آدمی اس کو پہلے ہی حل کر چکا ہے۔ اس نے اس کا حساب دیکھنا چاہا۔ مگر یہ نیوٹن کا کہہ تھا۔ کوشش کے باوجود بکھرے ہوئے بے ترتیب انبار میں متعلقہ کاغذ برآمد نہ ہو سکا۔ نیوٹن نے فوراً ہی ایک سادہ کاغذ لیا اور اس انتہائی پیچیدہ ریاضیاتی سوال کو دوبارہ حل کر کے اسی وقت ہلی کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا جب اسے معلوم ہوا کہ نیوٹن کی تصنیف Principia ابھی تک اس کے ڈسک کے ایک خانہ میں ردی کاغذات کی طرح بھری ہوئی رکھی ہے، تو اس نے کہا کہ ایسے قیمتی دماغ کے انکار اس طرح چڑے رہنے کے لئے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے خرچ سے اس کو چھپوانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح نیوٹن کی یہ کتاب پہلی بار دنیا کے سامنے آئی۔

نیوٹن صرف مادی دنیا کے کچھ حقائق جاننا چاہتا تھا، اس کے لئے اسے اس طرح مستغرق ہونا پڑا کہ وہ اپنا کھانا، اپنا سونا، اپنا آرام، اپنا ذوق، اپنی عادتیں، سب بھول گیا۔ تو آپ بھی خیرادی حقائق کا تصور اپنے ذہن میں جمانا چاہتے ہیں، ان کو شدید ذہنی استغراق کے بغیر کس طرح پاسکتے ہیں۔ آسمان پر جو ستارے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی حرکت کے قوانین مضبوط کرنے کے لئے نیوٹن کو انکار میں اتنا ڈوبنا پڑا تو اس نے اپنے آپ کو دنیا سے اٹھا کر اسی خلا میں پہنچا دیا ہے جہاں یہ روشن اجسام حرکت کر رہے ہیں۔ پھر وہ حقیقتیں جو ستاروں سے بھی دور ہیں، جو مٹتی ہوئی شکل میں بھی آنکھوں کو نظر نہیں آتیں، ان کو بے پناہ ذہنی کیسوئی کے بغیر کیسے گرفت کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ اس طرح خدا کی عبادت کریں گویا کہ آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قیامت اور جنت و دوزخ کا تصور ہر وقت آپ کی نگاہوں کے سامنے رہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایسے ہو جائیں کہ آپ جہاں ہوں اور جو کام بھی کر رہے ہوں، ہر حال میں آپ کا سینہ ”ذکر کثیر“ سے بریز رہے۔ اگر آپ اپنے اندر

وہ شدید یقینی اور وہ زبردست استحضار دیکھنا چاہتے ہیں جو دل کو پھلاوے اور آنکھوں کو اشکبار کر دے
تو یہ سب کچھ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آپ حدیث کے الفاظ میں ”تشعب ہوم“ کو ختم کر کے اپنی ساری نظریں
صرف ایک نقطہ پر لگا دیں۔ ارجن کے مشہور وادھ کی طرح آپ کو درخت اور چڑیا اور پتے اور یہیں نظر آئیں بلکہ صرف
ایک چیز نظر آئے۔ ”شکار کی ماین آنکھ“

جب آپ یہ ذہنی کم شکی ادویہ استغراق اپنے اندر پیدا کریں گے تو عادت اور ذوق کے تقاضے آپ کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے، لذتوں اور آسائشوں کا خیال مدہم چڑ جائے گا۔ فکر کی زیادتی جسمانی تقاضوں پر غالب آنے لگے گی۔ آپ کا ہنسنا اور ہونا کم ہو جائے گا، تصوراتی دنیا کو رہانے کی کوشش میں آپ مادی دنیا سے دور ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس وقت ممکن ہے لوگ کہیں تم پاگل ہو گئے ہوں۔ مگر اس سے گھبرائیے نہیں، کیونکہ یہی وہ صحیح ترین خطاب ہے جو کسی یا مقصد آدمی کو اہل دنیا کی طرف سے دیا جاسکتا ہے۔

۲۔ زہدیٰ الدنیا کے ذریعہ دوسری چیز جو حاصل ہوتی ہے وہ لطافت روح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مادی دنیا میں آدمی جتنا زیادہ مشغول ہوگا۔ اس کی روح میں اسی قدر کشاف پیدا ہوگی۔ اور جتنا وہ اس سے اپنے آپ کو دورے جائے گا اس کے بقدر اس کی روح پاک اور خالص ہوتی چلی جائے گی۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں رہبانیت کی تبلیغ کر رہا ہوں، رہبانیت دنیا سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کا نام ہے حتیٰ کہ اس مقصد سے اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مارڈالے تو یہ بھی رہبانیت فلسفہ کے مطابق جائز ہوگا۔ اس کے برعکس زہدیہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر اسی دنیا میں ہو۔ مگر اس سے بے رغبت ہو چکا ہو۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے زہنی حیثیت سے اس سے باہر نکل جائے۔ مومن بھی یقیناً راہب ہوتا ہے۔ مگر اس کی رہبانیت حسی رہبانیت ہے جب کہ دوسرے مذاہب جسمانی رہبانیت میں عقیدہ رکھتے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ نے کسی کے سینے میں دودل نہیں بنائے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے احساسات کسی ایک ہی چیز کے بارے میں شدید ہو سکتے ہیں۔ وہ دوسروں میں حرکت نہیں کر سکتے۔ اگر آپ دنیا اور اس کے سارے سامان کا ہمیت دینے لگیں تو آخرت کا خیال آپ کے اندر کمزور پڑ جائے گا اور اگر آپ آخرت کی فکر میں مشغول ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ ہو گا کہ دنیا کے بارے میں آپ پر غفلت طاری ہونے لگے گی جو شخص دنیوی قدروں کو اہمیت دیتا ہے، اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ آخری قدروں کو پامال کر رہا ہے۔ آپ کو ایسے ”خوش مذاق“ میں لگے جن کے کھانے کی پلیٹ میں مچھی پڑ جائے تو وہ اس کو کھانا نہ سمجھیں کریں گے۔ دوسری طرف ان کے اسلام میں کتنی ہی کھیاں پڑی سڑ رہی ہوں گی۔ مگر اس کی عفویت کا انھیں اندازہ نہ ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی طرف رغبت نے آدمی کی حسیات کو دنیا کے بارے میں تو بہت تیز کر دیا، مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرت کے بارے میں اس کی حسیات کند ہو کر رہ گئیں۔

یہ دنیا جو آپ کے جسم کو مٹا کرتی ہے۔ یہ آپ کی روح کی قاتل ہے۔ اگر آپ اس کے اندر لذت ڈھونڈنے

لیکن، اگر اس کے سطحی اور ظاہری ساز و سامان آپ کو اپنی طرف کھینچ لیں، تو وہ آپ سے آپ کا سب سے بڑا جوہر چھین لیں گے۔ اس کے بعد آپ کے نازک جذبات مردہ ہو جائیں گے، آپ کے اندر وہ لطیف احساسات ابھر نہیں سکتے جو اعلیٰ ترین حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔ جن پر تخلیقات الہی کا نزول ہوتا ہے۔ جس کے بعد آدمی تمام حجابات سے بلند ہو کر حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جس کے اندر دنیا سے بے رغبگی پیدا نہیں ہوتی، اس کے اندر گویا وہ صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوتی جو کسی حقیقت کو سمجھے اور اسے قبول کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسے دل میں حکمت کا "انبات" نہیں ہو سکتا۔ جس زمین میں اخذ کی صلاحیت نہ ہو وہ کیسے کسی بیج کو قبول کرے گی اور اس کے اندر ڈالا ہوا دانہ نشو و نما پا کر پورا درخت کیسے بن سکتا ہے۔ یاد رکھئے، حقیقت ایک غیر مادی چیز ہے۔ اس لئے وہ روح جو مادی آلاتوں میں پھنسی ہوئی ہو، وہ حقیقت کو بے نقاب حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا مشاہدہ ہمیشہ دھندلا مشاہدہ ہو گا جس میں حقیقت کے بعض رُخ دکھائی دیں گے اور بعض رُخ نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔

روح کی لطافت اور کثافت کوئی تصوف کا پُرا سرا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل ایک سادہ سی حقیقت ہے جس کو ہر شخص معمولی غور و فکر سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کا جو حیاتیاتی اور تصوراتی وجود ہے وہ کسی اور کی محبت میں اٹکا ہوا ہے یا اس نے اپنے آپ کو دوسری تمام چیزوں کی گرفت سے بالکل خالی کر دیا ہے تاکہ مالک حقیقی کی یاد آپ کی روح کو اپنا مسکن بنا سکے۔ گھر میوں میں اگر مسجد میں بجلی کا پنکھا چلایا جائے اور اس کی ہوا میں نماز ادا کی جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی اسے ناجائز نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر دل اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو یہ حال ہوتا ہے کہ مسجدوں میں نماز کے لئے آنے والے پنکھے کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے مسابقت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نماز کے دوران میں اگر کرنٹ رکرنے کی وجہ سے پنکھا بند ہو جائے تو سلام پھیرتے ہی ہر شخص کی نظریں اوپر اٹھ جاتی ہیں اور نماز کے بعد پورا سپلائی کے انتظام کی خرابی وہ اہم ترین موضوع ہوتا ہے جس پر لوگ اپنے جذبات اور اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی آرام طلبی نے آپ کی روح کو گندا کر دیا۔ اس میں گرمی اور سردی کے مسائل نے اپنے آشیانے بنا لئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی وہ نماز نہیں پڑھ سکتا جو ساری لذتوں سے بڑھ کر لذیذ ہے۔ جس میں مشغول ہو کر آدمی گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے، جب ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی دنیا سے نکل کر خدا کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

مجھ کو بار بار اس کا تجربہ ہوا کہ ایک شخص اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کے معاملے میں تو نہایت حساس ہے۔ اپنے طبی تقاضوں میں کمی کو وہ کسی حال میں برداشت نہیں کرتا۔ مگر ایسے معاملات جو خدا اور آخرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اس کی دوا می زندگی کو بہتر یا بدتر بنانے والے ہیں ان میں وہ اکثر نہایت سنگین حقیقتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے گویا ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس کے سامنے آپ قرآن و حدیث کے صریح ارشادات پیش کیجئے، مگر وہ ایسے سرسری جوابات دے کر بات کو ٹال دے گا کہ آپ حیرت میں یہ سوچتے رہ جائیں گے کہ ”دوبارہ ان کا کوئی جواب بھی دوں یا نہیں“ اس کی وجہ یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دنیا سے اوجھل کر دیتا ہے اور اپنا ہاتھ نہیں سکا۔ اس کے ایمان بالآخرت نے

اس کی روح کو ابھی تک دنیا کی کشافوں سے پاک نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی حیات انہیں معاملات میں زیادہ کام کریں گی جہاں وہ عملاً پڑا ہوا ہے۔ مگر جس دنیا سے وہ دور ہے جہاں اس نے ابھی تک اپنے آپ کو پہنچایا نہیں اس کی حقیقتوں کو وہ کیسے گرفت کر سکتا ہے اور ان کے ذکر سے کس طرح اس کے اندر بل پل برپا ہو سکتی ہے — شخصیت پرستی کسی کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند کر دے تو حق کی روشنی اس کے اندر کس راہ سے داخل ہوگی۔

اگر آپ چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے ہوں اور یکایک تار آئے کہ آپ کے اکلوتے لڑکے کا انتقال ہو گیا، تو دوسرے لوگ جیسے پہلے تھے ویسے اب بھی رہیں گے مگر آپ تڑپ اٹھیں گے۔ آپ کی حالت بالکل بدل جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق خبر آتی ہے اس کی خبر سننے کے لئے پہلے سے آپ کے دل کے تمام گوشے خانی تھے اس لئے وہ سیدھی آپ کے دل میں گھس گئی۔ اس کے برعکس بقیہ لوگوں کے دل میں اس نے جانے کا راستہ نہیں پایا کیوں کہ ان کے دل کچھ دوسرے لوگوں کی محنت سے بھرے ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جب قرآن کی ”تلاوت“ ہو رہی ہو۔ جب کلمات حکمت سنائے جا رہے ہوں، جب کوئی منادی کرنے والا ایمان کی منادی کر رہا ہو، تو اس کی آواز انہیں لوگوں کے دل سے ٹکرائے گی جنہوں نے اپنا سینہ اس کے لئے کھلا رکھا ہو۔ اور جس نے اپنے اندرون کو دوسری پرستشوں کا گودام بنا رکھا ہے اس پر کوئی آواز اثر نہیں کر سکتی، وہ تو اسی وقت سنے کا جب صاف عظیم اس کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

۳۔ زہد کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ آپ کے لازم زندگی میں کمی کر دیتا ہے۔ ہر با مقصد آدمی نظرًا ایک تضاد میں مبتلا کیا گیا ہے۔ ایک طرف اس کے جسم کے تقاضے ہیں جن کی فہرست کا کوئی شمار نہیں۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ ساری توجہ اسی کی طرف لگا دی جائے۔ اس تضاد کو ہم باطنی ختم نہیں کر سکتے ہماری بہترین عقل مندی یہ ہے کہ ہم اس میں کمی کی کوشش کریں۔ دنیا کے تمام وہ لوگ جنہوں نے کوئی بڑا کام انجام دیا ہے، وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے مجبور تھے کہ اپنے لازم حیات میں ہر ممکن حد تک کمی کریں۔ آپ کے سامنے بھی ایک عظیم مشن — دنیا کے سامنے حق کی گواہی دینے کا مشن، ہے۔ اس لئے اگر آپ اسے تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی اسی اصول پر عمل کرنا ہو گا۔ البتہ اس میں اسلام کے اپنے نظریہ زندگی کا لحاظ ضروری ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح شادی نہ کریں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح سگڑ نہ پیئیں۔ کیوں کہ شادی ایک حقیقی ضرورت ہے جب کہ تمباکو، انسان کی فطری ضرورتوں پر ایک مصنوعی ضرورت کا اضافہ ہے۔ لازم حیات میں کمی کا یہ پہلو تو بالکل واضح ہے کہ وہ آپ کو اپنے مقصد میں زیادہ حصہ لینے کے قابل بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی دیگر ضروریات کی فہرست جتنی مختصر ہوگی، اسی کے بقدر آپ اپنے مقصد کے کاموں کے لئے زیادہ فارغ ہوں گے۔ خلا کا ایک مسافر راکٹ میں بیٹھ کر تین سو میل فی منٹ کی رفتار سے اڑتا ہے۔ مگر اس سفر میں بھی بھاری بمبوسات اور مختلف قسم کے آلات سے وہ لیس ہوتا ہے، ان کو اپنے جسم پر لادے ہوئے زمین پر پیدل چلنا ہو تو وہ چند میل بھی نہیں سہی سہی سہی سے اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جاسکے گا۔ اسی طرح اگر آپ نے اپنی زندگی کو حقیقی ضروریات

کے ماسوا اور بہت سی ضرورتوں کا عادی بنالیا ہے تو ان کو لئے ہوئے آپ زمین پر نہیں چل سکتے۔ جب تک یہ لوازم آپ کے گرد جمیا ہوں آپ متحرک نظر آئیں گے۔ مگر جہاں یہ لوازم نہ ہوتے، آپ اسی طرح اپنے آپ کو بے بس پائیں گے جیسے شاہی سلطنت کے آخری شہزادے پاگلی کی سواری کا عادی ہونے کی وجہ سے غدر سے دقت بھاگ نہیں سکے اور ان کے دشمنوں نے محل میں گھس کر ان کے بستروں پر انھیں قتل کیا۔

مگر لوازم حیات کو مختصر کرنے کا ایک اور فائدہ ہے جو اسلامی اعتبار سے اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح کے لوازم میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آپ کے اندر زیادہ سوز اور اخلاص پیدا ہوگا۔ اگر آپ کو ایک ہزار میل دور سے اگر یہاں تقریر کرنی ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے لئے اسپیشل سیلون میں سفر کرنا ضروری ہے تاکہ جب میں اسٹیشن پر اتروں تو باطل تازہ دم رہوں اور جلسہ گاہ پہنچ کر اپنے موضوع پر اچھی طرح بول سکوں، بیشک آپ کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ کسی کو جرات نہیں کہ اس کے خلاف فتویٰ دے سکے۔ بلکہ بہت سے ظاہرینوں کو آپ کا زور خطاب اس دلیل کی حقویت ماننے پر یہاں تک مجبور کر سکتا ہے کہ وہ آپ کے لئے مخصوص سیلون میں سفر کرنا ہی افضل سمجھے۔ لیکن کیونکہ اس کے بغیر تہی شان دار تقریر و جدوجہد میں آسکتی تھی۔ مگر میں کہوں گا کہ خدا کو شان دار تقریر مطلوب نہیں ہے۔ اس کو تو آپ کے دل کے ٹکڑے درکار ہیں۔ اور وہ تقریر جس میں آپ کے دل کے ٹکڑے الفاظ بن کر نکلیں، جو دوسروں کو متاثر کرنے سے پہلے خود آپ کو رلا دے، جو تقریر نہ ہو بلکہ درد اور تڑپ کا ایک محکم اخبار ہو۔ وہ تو اسی وقت ممکن ہے جب کہ آپ بے آرامی سے سفر کر کے یہاں پہنچے ہوں جس میں یہاں تک اپنے آپ کو لانے میں اپنے مشقت اٹھائی ہو جو آپ کے لئے بعض سفر نہ ہو بلکہ خدا کی طرف بڑھنے کا ایک مجاہدہ ہو۔ ایسی ہی ایک نیاں سے کلمات مدد مل سکتے ہیں۔ درد مند کلام، خدا کا ایک الہام ہے جو براہ راست عالم الغیب و المشاہدہ کی طرف سے آپ کے اوپر افقا کھاتا ہے۔ اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا الہام ایک ”قول قاتل“ ہے جو کسی ایسے قلب ہی پر ستر سکتا ہے جو ”وہا شہید“ کے مرحلے سے گزر چکا ہو (سورہ مزمل)

امام احمد اور امام ترمذی کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بار اپنے رسول کو سونے کی عظیم ترین کان دینے کی پیشکش کی، رسول نے حجاب دیا، خدا یا نہیں، بلکہ مجھے اس طرح رکھنے کہ کسی روز کھاؤں اور کسی روز بھوکا رہوں۔ تاکہ جب میں کھاؤں تو آپ کا شکر ادا کر دوں اور جب بھوک ساؤ تو آپ کے سامنے گرے و زاری کر دوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی حالات کے بغیر اپنے اندر کیفیات پیدا نہیں کر سکتا۔ جو حالات سے خالی ہو جائے وہ کیفیات سے بھی خالی ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سختی اور مشقت کے لمحات اپنے اندر دو طرفہ فائدہ رکھتے ہیں۔ ایک طرف ان سے وہ ”درد“ حاصل ہوتا ہے جو دل کی زندگی ہے، جو آپ کو احساس حیات سے آشنا کرتا ہے۔ جو انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والا ہے۔ دوسری طرف مشقت کے لمحات ہی آپ کی راحت کے لمحات کو اسلامی رنگ دیتے ہیں۔ وہ آدمی کو اس قائل بناتے ہیں کہ جب وہ ایسی کوئی چیز دیکھے تو اس کا دل شکر کے جذبے سے لبریز ہو جائے۔ جو درد سے خالی ہے وہ زندگی سے خالی ہے، اور جو زندگی سے محروم ہو وہ کیسے کوئی بات سنے گا اور کیسے کوئی بات قبول کرے گا۔

۴۔ زہد فی الدین کا ایک اور پہلو ہے۔ وہ یہ کہ ایسا آدمی حرام اور مشتبہ چیزوں میں پڑنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ناجائز چیزوں کے ارتکاب سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو جائز حدود میں بھی پڑ کر چلتا ہے۔ جو تمام ”جائز“ چیزوں کو اپنا ضروری حق سمجھے، ایسے آدمی کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی حرام کام میں پڑ جائے۔ حدیث کے الفاظ میں، ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور ہڈا کی چراگاہ وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔ جو شخص سرحد تک اپنے مویشی چراتا ہوا پہنچ جائے اس کے لئے ہر آن یہ خطرہ ہے کہ مویشی کہیں چراگاہ کے اندر نہ گھس جائیں۔ (متفق علیہ) عورتوں کے لئے زیب و زینت باطل جائز ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر وہ گھر جس نے اس حوازا کو اپنے لئے کھلا دروازہ کھلے رکھا ہے، آج اس کے یہاں غیر سائرہ طلبہ رسالت اس طرح استعمال ہونے لگے ہیں کہ اب لوگوں کو شاید ان کے ممنوع ہونے کا بھی احساس نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے بے دین گھرانے اور اسلام پسند گھرانے میں بس اتنا ہی فرق رہ گیا ہے کہ ہمارے گھروں کی عورتیں اور لڑکیاں خانہ زاد اور رشتہ کے لوگوں اور دوسرے ملنے والوں کے سامنے اپنی غیر شرعی پوشاک کا مظاہرہ کرتی ہیں اور دوسرے گھروں کی عورتیں اپنے اس فتنہ کو لئے ہوئے بازاروں اور سڑکوں پر نکل آتی ہیں۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں جو لوگ ترقی کرتے ہیں یا بڑے عہدے حاصل کرتے ہیں وہ ضمیر کی قربانی دے کر ہی ان مناصب تک پہنچتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں کسی اچھی کرسی کو اپنی نشست گاہ بنانے کے لئے جو ایاق درکار ہے اس میں سے ایک ضروری چیز یہ بھی ہے کہ دین کو آپ اپنے اندر سے کھریج کر نکال دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بادشاہوں سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں کہا تھا ”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ان کی دنیا میں سے جتنا یاد گے اس سے زیادہ وہ تمہارے دین میں سے لے لیں گے“ یہ بات جدید بادشاہت کے بارے میں بھی اسی طرح صریح ہے جیسے وہ قدیم بادشاہت کے بارے میں صریح تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے وہ دین کا زیادہ حصہ لیتے تھے ادب وہ آپ کا کل دین لے لیتے ہیں۔

ایک بڑے تاجر نے ایک مرتبہ کہا کہ موجودہ زمانے میں بالکل جائز طریقہ پر کوئی بڑا کاروبار نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں آپ کی آمدنی ایک خاص حد سے آگے بڑھی، بے شمار قوانین آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ آپ مجبور ہوتے ہیں کہ غلط طریقے سے کام کریں۔ ورنہ آپ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اتنے بڑے کاروبار کا آپ کو کلفت کس نے کیا ہے؟ جواب دینے والے نے جواب دیا۔ مگر موجودہ انسان کو اس قسم کے جوابات سے کوئی دل چسپی نہیں۔ اس نے قویہ طے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے امکان بھران تمام نعمتوں کو حاصل کرے گا جو خدا نے زمین پر پیدا کی ہیں۔ اس لئے یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو اپنے لئے حلال کر لے جس کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا ہر واقعہ جو آپ کو اپنے گرد و پیش نظر آتا ہے، وہ صرف حکمت زہد سے محرومی کا ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ٹھہ کر وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی بڑھتے بڑھتے خدا کی حرام کی ہونی چراگاہ میں گھس گیا ہے۔ اس کے بغیر وہ اتنی غیر معمولی فریبی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

ممکن ہے یہ باتیں سن کر آپ کہیں کہ اسلام کا مطلب اگر یہی ہے تو اس کا پانا بہت مشکل ہے۔ بیشک اسلام کا

پاناہت مشکل ہے مگر وہ خدا کی مدد سے آسان ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جب روح دین کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ”میں تم سے کہتا ہوں کہ ادوٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو“ تو ان کے شاگرد یہ سن کر بہت اچھی طرح پڑ گئے اور کہنے لگے کہ پھر کون نجات پاسکتا ہے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا — ”یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے“ اگر آپ اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ وہ حیات طیبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے تو اس کو پانے کی صورت یہی ہے کہ آپ اسے خدا سے مانگیں۔ دوسری تمام چیزوں کی طرح یہ سب سے قیمتی چیز بھی آپ کو خدا ہی سے ملے گی۔ کہیں اور سے آپ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر یاد رکھئے خدا سے مانگنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دعا کے کچھ مقرر الفاظ یاد کر لیں اور اسے اپنی زبان سے دہرا دیا کریں ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں :-

God is not a Cosmic belly-boy for whom
we can press a button to get things.

خدا سے مانگنے کی اصل زبان وہ نہیں جو لفظوں کی صورت میں اپنے مطالبات کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے مانگنے کی زبان آپ کا قلب ہے۔ آپ اپنی حقیقی زندگی سے جو کچھ چاہ رہے ہیں وہی دراصل آپ اپنے رب سے مانگتے ہیں۔ خدا آپ کے لفظوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ خود آپ کو دیکھتا ہے۔ آپ اپنے اصل وجود میں جس چیز کے لئے بے قرار ہوں اپنے رب سے آپ اسی چیز کے طلب گار ہیں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دیدے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو سیان میں مبتلا کر دے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے، آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دینداری میں ڈال دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی تاریک کوٹھری میں بند کر دے۔ آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو ظاہر ہے کہ بیسے خراب کرنے کے باوجود آپ خالی ہاتھ واپس لوٹیں گے۔ اسی طرح اگر زبان سے آپ دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہمت کسی اور طرف متوجہ ہو تو میں کہوں گا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یاد رکھئے، یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدا میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے سامنے خزانے کے ساتھ آپ کے قریب ترین اگر آواز دیتا ہے۔ ”کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں، مگر تجھیں لینا ہے وہ سوہنے ہوں تو میں دینے والے کا کیا تصور۔ (زندگی شعبان ۱۳۸۱ھ)

تقریر حلقہ دار اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام جون پور۔ ۱۲ نومبر ۱۹۶۱

دعوت اسلامی کے کارکنوں کی ذمہ داریاں

دنیا میں روزانہ لاکھوں آدمی پیدا ہوتے ہیں اور لاکھوں آدمی مرتد ہوتے ہیں۔ وہ یہاں آنکھیں بند کئے ہوئے آتے ہیں اور انھیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور انھیں کیا کرنا چاہئے۔ پھر صبح یا غلط جو کچھ ان کی سمجھ میں آتا ہے کرتے ہیں اور دوبارہ آنکھیں بند کر کے اسی دنیا کی طرف لوٹ جاتے ہیں جہاں سے وہ آئے تھے۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور سندرہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔ یہ ایک عظیم خطرہ ہے جس سے انسانی نسل دوچار ہے۔ دنیا کی مثال ایک ایسی ریل گاڑی کی ہے جو بہت تیزی کے ساتھ اپنی پٹری پر دوڑی چلی جا رہی ہے۔ اس کو کچھ نہیں معلوم کہ آگے کیسے بہے۔ حالانکہ آگے کا ٹکڑ لوٹ چکا ہے اور وہاں پہنچنے ہی وہ اپنے انجن اور گاڑی سمیت الٹ جائے گی اور اس کے بعد تمام مسافر خواہ وہاں کے درجہ میں سفر کر رہے ہوں یا نیچے کے درجہ میں، سب کے سب ایک ہی ہولناک انجام سے دوچار ہوں گے، حتیٰ کہ اس وقت کوئی خطرہ کی زنجیر بھی نہ ہوگی جس کو کھینچ کر وہ اپنے آپ کو تباہی سے بچا سکیں۔ یہ زندگی کے بعد آنے والے روز حساب کا خطرہ ہے جو ہم کو اور ساری دنیا کو درپیش ہے۔ یہ اس اصل زندگی کا مسئلہ ہے جو ہمارے آج کے اعمال کے نتیجہ میں ہم کو آئندہ دائمی طور پر گزارنی ہوگی۔ وہ زندگی یا قومیت خوش گوار ہے یا بے حد دردناک۔

دنیا کے لوگ زندگی میں ہائیڈروجن بم کے خطرہ سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ مگر موت کے بعد ہر شخص کے سامنے جہنم کے عذاب کا خطرہ ہوگا جو اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ اس خطرہ سے آپ ہی دنیا کو باخبر کر سکتے ہیں۔ سوچئے کہ اس بھاری ذمہ داری کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ دنیا نادان ہے اور آپ علم رکھتے ہیں۔ دنیا سے صرف یہ پوچھا جائے گا کہ اس نے خدا کے حکموں کے مطابق زندگی بسر کی یا نہیں۔ مگر آپ سے اس کے سوا یہ سوال بھی ہوگا کہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے تم نے کیا کیا۔ دنیا کو صرف اپنا جواب دینا ہوگا اور آپ کو اپنا بھی اور دنیا والوں کا بھی۔

یہ عظیم ذمہ داری جو آپ کے حصہ میں آئی ہے، اس کا خیال بھی آپ کو بے چین کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آپ کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون حرام ہو جائے۔ دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں آپ کے لئے کوئی دل چسپی باقی نہ رہے۔ آپ یہ بھول جائیں کہ آپ بھی کچھ ضروریات رکھتے ہیں آپ کو صرف یہ یاد رہے کہ دنیا کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کو اپنے گھروں، اپنی جائیدادوں اور اپنے اہل و عیال سے زیادہ دنیا کی اصلاح کی فکر ہو۔ آپ کی زبانوں پر ہر وقت اسی کا چرچا ہو کیوں کہ اس کے سوا کچھ ہے اس کا چرچا کرنے والے دنیا میں بہت لوگ ہیں آپ ان میں مشغول ہو کر اپنا وقت ضائع کریں گے اور دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ آپ کے قدم حرکت کریں تو اس راہ میں حرکت کریں کیوں کہ اس کے سوا جتنے راستے ہیں وہ سب یا تو غلط ہیں یا بے فائدہ۔ آپ کے اوقات یا تو زندگی کی ناگزیر ضروریات فرم کرنے میں صرف ہوں یا پھر اسی دعوتی مقصد کے لئے جدوجہد کرنے میں۔ آپ کی خواہشات، آپ کی تمنائوں اور آپ کی دل چسپیوں کا کوئی دوسرا مرجع باقی نہ رہے۔ آپ ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی ایک کام کے ساتھ جڑ جائیں۔ آپ کی جانوں اور مالوں پر صرف اسی چیز کا حق ہو۔ غرض آپ اور جو کچھ آپ کے پاس ہے ان سب پر سب سے پہلے اسلامی دعوت کا حق ہو اور اس کے بعد

دوسری چیزوں کا۔ فائر بریگیڈ کی طرح آپ چوبیس گھنٹہ اپنے آپ کو ڈیوٹی پر رکھیں اور کبھی اس سے غافل نہ ہوں۔ بے شمار انسانوں کی اس بھڑپ میں چند انسان جو حق کا کام کرنے کے لئے اٹھتے ہیں باوجود لوگ بھی اپنی زندگیوں اس کے لئے وقف نہ کریں تو پھر دوسرے لوگ کہاں سے آئیں گے۔

یہاں کہہ دوں انسان ہیں جو اس لئے صبح کرتے ہیں کہ دن کے اچالے میں اپنی روزی کمائیں اور اس لئے شام کرتے ہیں کہ دن بھر کی تھکان دور کر کے اگلے روز پھر اسی مشغلہ میں جتنے کے قابل ہو جائیں۔ وہ کہیں سفر بھی کرتے ہیں تو وہ سفر یا تفریح کے لئے ہوتا ہے یا روزگار کے لئے۔ اس بھڑپ کے اندر دوسرے تمام لوگوں کے خلاف آپ نے ایک نئے راستہ پر چلنے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ دنیا کے بجائے آخرت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس راہ کا تقاضا ہے کہ آپ کی مائیں اس غم میں بسر ہوں کہ جس دنیا میں آپ رہ رہے ہیں اس پر شیطان اور طاغوت کا غلبہ ہے۔ آپ کی صمیمیں اس یاد کے ساتھ طلوع ہوں کہ خدایا جس طرح سورج نے خشکی اور تری کو روشن کیا ہے اسی طرح تو انسانی زندگیوں کو بھی ہدایت سے منور کر دے۔ آپ نکلیں تو خدا کی راہ میں نکلیں اور گھر میں تو خدا کے لئے گھر ہیں۔ آپ جنت کے امیدوار ہیں۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ جنت کس طرح ملتی ہے۔ جنت میں وہ قدم نہیں جائیں گے جو خدا کی راہ میں گر دے اور نہ ہوئے ہوں۔ جنت کو وہ اکٹھ نہیں دیکھی جو خدا کے خوف سے تر نہ ہوئی ہو۔ جنت میں وہ وجود نہیں جائے گا جس نے آخرت کے لئے دنیا کی مصیبتیں برداشت نہ کی ہوں پھر سوچئے کہ آپ کہاں تک ان شرطوں کو پورا کر رہے ہیں۔

ہم اس وقت ایک ہولناک طوفان کے سرے پر کھڑے ہیں۔ جس نے چند مقتول کے اندر اس صلیب کی تفسیر یا پانچ سو سبستیوں کو دیران کر دیا ہے اور ہزاروں انسانوں کو مٹا کر کیا ہے شہر کا یہ حال تھا کہ دریا کے پانی نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا جس کے درمیان وہ بائیں جزیرہ بن گیا تھا۔ کنرے کے باشندے اپنے گھروں کو اس طرح خالی کر رہے تھے کہ ان کے گھروں کی گرتی ہوئی دیواریں ان کو رخصت کر رہی تھیں۔ اس سیلاب نے پچھلے سو برس کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ شہر کے گرد ایک بہت بڑا باندھ ہے جو ۱۸۷۱ کے تاریخی سیلاب کے بعد بنایا گیا تھا۔ اسی باندھ سے اس وقت شہر کی قسمت بندھی ہوئی تھی جس کے دوسری طرف شہر کی عام سطح سے کئی گز اونچا پانی لگا ہوا تھا۔ ہر گھر میں اسی کا چرچا تھا اور ہر شخص کی زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ یہاں تک کہ ۲۶ اور ۲۷ جولائی ۱۹۵۵ کی درمیانی رات کو کلکٹر کی طرف سے بذریعہ لاؤڈ اسپیکر یہ اعلان ہوا کہ:

”لال ڈبلی کا باندھ ابھی ٹوٹنا چاہتا ہے آپ لوگ اپنی جانوں کو بچانے کے لئے اونچی جگہوں پر چلے جائیں۔“ اس وقت رات کے ایک بجے تھے۔ سارا شہر جاگ اٹھا اور عجیب سی جھپٹیں گئی۔ لوگ اپنے کچے اور پکے گھروں سے نکل کر باندھ کی طرف دوڑے اور سیکڑوں آدمیوں نے پھاؤ ڈالا اور بوریالے کر اس جگہ ٹی ڈالنی شروع کر دی جہاں سے باندھ پھٹ گیا تھا۔ ایسے ایسے لوگ جنھوں نے شاید زمین پر بھی ننگے پاؤں قدم بھی نہ رکھا ہو گا۔ وہ سردوں پر مٹی کا ٹوکرا لے کر دھوہے تھے۔

۵۰ اشارہ ہے اس تاریخی سیلاب کی طرف جس نے ۱۹۵۵ کی برسات میں مشرقی ہندوستان کو زبردست نقصان پہنچایا۔

درجنوں میٹریکس کی روشنی میں ساری رات کام ہوا اور دوسرے دن دوپہر تک ہوتا رہا۔ بالآخر انجینئر نے کہہ دیا کہ اب باندھ قابو سے باہر جا چکا ہے۔ ابچے دن کے بعد باندھ ٹوٹ گیا اور دم کے دم میں پانی سڑکوں پر بہنے لگا۔ سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگ رہے تھے اور پانی ان کے پیچھے اس طرح دوڑ رہا تھا گویا ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ زندگی کے مسائل سمٹ کر بس سیلاب کے گرد جمع ہو گئے اور چند دنوں کے لئے شہر میں قیامت کا منظر دکھائی دینے لگا۔

اس سیلاب میں ہمارے لئے بہت سی نصیحتیں اور عبرتیں ہیں مگر میں اس وقت جس چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ایک اس سے بھی زیادہ ہونک طوفان صرف ایک منٹ کو بلکہ ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے اور تمام انسانوں کی زندگی اس کی زد میں ہے۔ سیلاب کا خطرہ ایک ایسا خطرہ ہے جس کو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ان کی زندگی کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے مگر حق کو اختیار نہ کرنے کا جو خطرہ ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا، اور نہ کوئی شخص یہ جانتا ہے کہ اس کی زندگی کو کیا نقصان پہنچنے والا ہے۔ سیلاب کے خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ لاڈلے بیکر کے ذریعہ ایک اعلان کر دیا جائے۔ مگر جس خطرہ سے دنیا کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں اس کا سمجھنا بھی دنیا کے لئے مشکل ہے۔ آئیٹن سٹارن کا نظریہ اضافیت اور ایٹم کی حقیقت لوگوں کو سمجھائی جاسکتی ہے مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ حق سے بے نیاز ہو کر وہ ایک ایسے جوالا کھی پہاڑ کے دروازے پر بیٹھ ہوئے ہیں جو کسی کی بھی وقت پھٹ کر ان کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

ہمارا کام محض اس طرح نہیں ہو سکتا کہ اپنے پیغام کو کسی نہ کسی طرح لوگوں کے کان میں ڈال دیں بلکہ میں اس کو دلائل بنا کر ان کے سامنے رکھنا ہو گا اور اس کے لئے لمبی مدت تک زبردست جدوجہد کرنی ہوگی۔ ایک ایسی چیز جو وقت کے بیچانوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ بے وزن ہے اس کو اس انداز میں پیش کرنا ہو گا کہ وہ دوسری تمام چیزوں کے مقابل میں سب سے زیادہ با وزن نظر آنے کے یہاں تک کہ لوگ اس پر سوچنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگیں کہ اس ایک راستہ کے سوا تمام راستے باطل غلط اور تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ اس کے لئے میں اپنے دماغ اور اپنے جسم کی ساری قوتیں صرف کرتی ہوں گی۔ اپنے اوقات اور اپنی کمائیوں کا سب سے بڑا حصہ اس مقصد عظیم کی نذر کرنا ہو گا۔ اور یہ سب کچھ کسی ایک رات اور کسی ایک دن کے لئے نہیں بلکہ سالہا سال کے لئے اور ساری عمر کے لئے کرنا ہو گا۔ ہمیں اس مقصد کے لئے قربان ہو جانا پڑے گا اور اپنی زندگیوں کو اس راہ میں کھپا دینا ہو گا۔ جیسی یہ ممکن ہے کہ لوگ ہمارے پیغام سے واقف ہوں اور آئے والے خطرہ سے آگاہ ہو کر اس سے بچنے کا سامان کر سکیں۔ پھر کون ہے جو حق کے لئے قربان ہوتا ہے۔ کون ہے جو دنیا کو تباہی سے بچانے کے لئے جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ کون ہے جو اس کو بھڑکتا ہے جو کہ اس کی نظروں کے سامنے ہے تاکہ وہ اس کو پاسکے جو کہ اس کی نظروں سے اوجھل ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس کا حوصلہ کر سکیں کیوں کہ وہی انسانیت کا اصل جوہر ہیں اور وہی ہیں جو زندگی کی اصل کامیابی کے حق دار ہوں گے۔ (مطبوعہ سہ روزہ دعوت ۵ ستمبر ۱۹۵۵ء)

تقریر ماہانہ اجتماع جماعت اسلامی، بمقام سیدھا سلطان پور (عظم گڑھ) ۵ اگست ۱۹۵۵ء

دفتر کے صحن میں دوڑنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا، دیکھا تو ہا کر ہاتھ میں اخبار لئے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول ہے۔ صبح کا اخبار اول ترین وقت میں تمام خریداروں کے پاس پہنچانے کا اس کو اتنا خیال ہے کہ وہ دوڑتا ہوا پتلا ہے۔ اور اگر اخبار لینے کے بعد اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ ٹھہر کر اس کا جواب نہیں دے گا بلکہ واپس بھاگتے ہوئے کہتا چلا جائے گا۔ وہ دوڑ رہا ہے تاکہ وہ بھاگتے ہوئے وقت کو بکڑے، تاکہ وہ وقت کے پیچھے نہ رہ جائے۔

یہ دنیا کے لئے انسان کی دوڑ دھوپ کی ایک مثال ہے جس کو آپ اپنے قریب ترین دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ صبح کی کپچائے میں طویل وقت صرف کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے درمیان بے تکلف باتیں کرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ اخبار کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ آخرت کے اقرار میں اتنے سنجیدہ بھی نہیں ہیں جتنا وہ شخص اپنے پیشے میں سنجیدہ ہے جس کا آپ انتظار کر رہے ہیں۔ آپ مسلمان ہیں، آپ اسلام کے ذاتی ہیں، لیکن اگر صورت حال یہ ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کا مسلمان ہونا آپ کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ آپ کی اسلامی دعوت محض اس سے ایک رفاہی وابستگی کا نتیجہ ہے یا زیادہ سے زیادہ وہ ایک ذہنی موضوع ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ آخرت کے لئے اس سے زیادہ بیتاب ہوتے جتنا ایک دنیا پرست دنیوی فائدوں کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ آخرت کی طلب میں آپ اس سے زیادہ تیز دوڑنے کی کوشش کرتے جتنا کوئی شخص اپنی ملازمت اور کاروبار کے لئے دوڑتا ہے، اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کے استعمال میں آپ اس سے زیادہ مستعد ہوتے جتنا کہ ایک اخباریچے والا اپنے کام میں نظر آتا ہے۔

اسلام آدمی کو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کے لئے بلاتا ہے۔ جس کے دل میں یہ بات اتر گئی ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص غیر متعلق کام میں یا کمتر درجے کے مقاصد میں اپنا وقت ضائع کرے، اسلام ہم کو موجودہ زندگی کی غفلتوں کے بدلے بے پناہ عذاب سے ڈراتا ہے۔ جو شخص فی الواقع اس خبر پر ایمان لایا ہو کیسے ممکن ہے کہ آپ اس کو بے فکری کے ساتھ تہقہہ لگاتا ہوا پائیں۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارے اوپر ایک عظیم خدا ہے جو ہر وقت تمہیں دیکھ رہا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو مانتا ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی ایسے مشاغل میں مصروف ہونا پسند کرے جس کی خدائے ذوالجلال کے نزدیک کوئی قیمت نہ ہو، اسلام کہتا ہے کہ تمہاری زندگی باطل غیر یقینی ہے، کسی بھی وقت موت کے فرشتے تمہاری گرفتاری کے لئے پہنچ سکتے ہیں۔ جو شخص حقیقی معنوں میں اس انتہائی نازک صورت حال کا احساس رکھتا ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ روزانہ اپنے اوقات کا ایک حصہ ایسے مشاغل میں صرف کرتا رہے جس کا طلب آخرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو شخص خدا سے ڈرتا ہو اس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ ایک کام کو مہینوں اور سالوں کی تار سے اور اس کو احساس نہ ہو کہ وہ ایک غلطی کو دہرا رہا ہے۔

"کیا یہی وہ تصویریں ہیں جو خدا اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد بنتی ہیں؟ یہ فقرہ اکثر ایک دردناک آہ کے ساتھ میری زبان سے اس وقت نکل جاتا ہے جب میں اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ انسان کے لئے اس کے معاشی مفادات

آخری تقاضوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ خدا کی مرضی کے لئے سرگرم ہونے سے زیادہ اس کو یہ بات محبوب ہے کہ وہ اپنے ذوق کی تسکین اور اپنی عادتوں کی تکمیل میں لگا رہے۔ وہ اپنی زندگی کے مقررہ نقشہ کو نہیں بدل سکتا، خواہ اس کی وجہ سے اس کی عبادتیں ناقص ہو جائیں، خواہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک انجام نہ دے سکے، خواہ اس کو بالآخر اپنی بے حسی اور ناکردگی کو چھپانے کے لئے جھوٹے عذرات کا سہارا لینا پڑے۔

یہ شکایت مجھے صرف ان لوگوں سے نہیں ہے جو علوانہ ماحول میں پرورش پا کر نکلے ہیں۔ وہ لوگ جو ”دیندار“ کہے جاتے ہیں۔ جن کی طرف اسلامی مسائل معلوم کرنے کے لئے رجوع کیا جاتا ہے۔ ان کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے چند دن پہلے میں ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک پرورش آواز میرے کان میں آئی۔ ”ہر آدمی کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو پھلتا پھوٹا دیکھے اس سے دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے۔“ دیکھا تو ایک بزرگ ایک مکان میں بیٹھے تقریر کر رہے تھے۔ چہرے پر فحاشی ان کے دین دار ہونے کی علامت تھی اور زبان اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ یقیناً کوئی عالم ہوں گے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ کوئی ناجائز خواہش ہے۔ مگر حجب میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اندر یہ تنا تو بہت زیادہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو پھلتا پھوٹا دیکھیں مگر اسلام کو پھلتا پھوٹا دیکھنے کی ترپ ان میں باقی نہیں ہے، تو یہ جائز خواہش بھی مجھے ایک جرم معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بزرگ کو میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ وہ ایک نوجوان کو اس بات پر تنبیہ کر رہے تھے کہ وہ نماز کے بعد دعا کے لئے نہیں ٹھہرتا بلکہ سلام پھیرنے کے بعد فوراً اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ بے شک یہ نوجوان کی غلطی تھی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ خود ان بزرگ کا یہ حال ہے کہ صبح کی اور دوپہر کی نیند اکثر انھیں فرار و ظہر کی نمازوں میں وقف پر مسجد پہنچنے نہیں دیتی۔ شام کی گفتگویں وہ کبھی کبھی اتنا مصروف ہوتے ہیں کہ مسجد اس وقت پہنچنے میں جب امام ایک رکعت پوری کر چکا ہوتا ہے۔ آپ کو ایسے کہنے ”عالم دین“ ملیں گے جن کے سامنے اگر دو تین منکم امتہ میں دعوت الی الخیر کا ترجمہ ”تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے“ کر دیا جائے تو وہ اس پر دو گھنٹے بحث کریں گے کہ یہاں جن ”تبہ عنہ“ نہیں بلکہ ”بیانیہ“ ہے۔ یعنی آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”تم کو ایسا گروہ بننا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے“۔ (نہ یہ کہ تم میں سے۔۔۔) مگر ان حضرات کے ساتھ آپ جہنوں اور سالوں زندگی گزاریں، آپ یہ نہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر فی الواقع دعوت الی الخیر کی کوئی واقعی ترپ پائی جاتی ہے۔ وہ آیت میں عموم ثابت کرنے کے لئے قابلیت صرف کریں گے۔ مگر اس عموم کو اپنی ذات تک پہنچانے کی ضرورت نہیں سمجھیں گے۔ صلوٰۃ و سنی کا ترجمہ اگر ”بیچ کی نماز“ یا ”عصر کی نماز“ کر دیجیے تو وہ آپ کے اوپر جہات کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ وہ اصرار کریں گے کہ قرآن میں جو صلوٰۃ و سنی کا لفظ آیا ہے اس سے مراد ”بہترین نماز“ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے مراد کوئی ایک نماز نہیں بلکہ ساری نمازیں ہیں۔ مگر ان کی اپنی نمازوں کو دیکھئے تو آپ یہ نہ پائیں گے کہ وہ اپنی نماز کو ”بہتر“ بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ دوسروں پر تبلیغ کرتے ہوئے وہ نہایت جوش کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کریں گے کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر فزودہ بدر کے لئے نکلے، دوسری طرف مشرکین کا لشکر تھا۔ آپ نے فرمایا،

بڑھو ایک ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے۔ ایک انصاری غیر بنی حام نے یہ سنا تو ان کی زبان سے بخ بخ کے الفاظ نکل گئے یعنی خوب! آپ نے فرمایا، تم نے بخ بخ کیوں کہا۔ انھوں نے جواب دیا۔ خدا کی قسم صرف اس لئے کہ شاید میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں تم انہیں میں سے ہو۔ یہ سن کر انھوں نے اپنے بطن میں سے کچھ کھجوریں نکالیں اور اسے کھانے لگے۔ پھر بولے ان کھجوروں کو کھانے کے لئے میں کب تک زندہ رہوں گا۔ اِنَّمَا خَلِقْتُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ یہ تو بڑی لمبی زندگی ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے بقیہ کھجوریں ایک طرف ڈال دیں اور جنگ میں کود پڑے اور لڑ کر شہید ہو گئے۔ (مسلم)

مگر خود ان مبلغین کا کیا حال ہے۔ مذکورہ صحابی نے تو خدا تک پہنچنے کے شوق میں اپنی دائمی خوراک چھینک دی تھی مگر یہ حضرات اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کو بھی خدا کی خاطر چھینکنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بدر کے میدان میں اسلام اور کفر کا جو معرکہ ہوا تھا وہ آج ہر گلی اور ہر شہر پر پوری شدت کے ساتھ جاری ہے مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وقت کے اس غروب میں شرکت کے لئے اپنے موجودہ مفاد کو ترک کرنا تو درکنار مستقبل کی تنہاؤں اور اپنی آنے والی پشتوں کے مفاد کو بھی خدا کے دین کے لئے خطرے میں ڈالنا وہ گوارا نہیں کر سکتے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اسلام کے دعوے کے ساتھ اتنے بڑے تضاد کو لوگ کس طرح اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہیں۔ ہر بار مجھے یہی جواب ملا کہ دراصل ”تاویل“ کے فتنے نے لوگوں کو اس تضاد میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہر آدمی نے اپنے طرز عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کچھ خوب صورت جوابات تراش رکھے ہیں اور ضرورت کے وقت وہ فوراً انھیں پیش کر دیتا ہے۔ ایک مسلمان ڈاکٹر کو میں نے ایک بار دعوت دین کی جدوجہد میں حصہ لینے کی ترغیب دلائی۔ انھوں نے فوراً اپنے پیشے کی اہمیت پر تفرش شروع کر دی۔ ان کے نزدیک ان کا پیشہ خدمت خلق کا ایک زبردست کام ہے جس کو وہ مات دن کی محنت سے انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے بعض سنگین مریضوں کا ذکر کیا جو ان کے زیر علاج تھے۔ انھوں نے کہا ”بتائیے میں انھیں چھوڑ کر کیسے کہیں جاسکتا ہوں۔ میرا ایسا اقدام انسانیت دوستی ہوگی یا انسانیت دشمنی“ بظاہر یہ بہت معقول جواب ہے۔ لیکن اگر میں آپ کو یاد دلاؤں کہ اکثر ڈاکٹر دل کی ”انسانیت دوستی“ ہمیشہ ان مریضوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے جو اس کے زیر علاج ہوں اور ان میں بھی سب سے زیادہ اس کی توجہ کے مستحق وہ مریض ہوتے ہیں جو زیادہ ”قیمتی گاہک“ ہوں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ اس خدمت خلق کی حقیقت کیا ہے۔

اسی طرح ہر شخص کے پاس اپنے طرز عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک جواب موجود ہے۔ کوئی لوگوں کی ناکردگی کو اس بات کے لئے کافی سمجھے ہوئے ہے کہ وہ خود بھی کوئی کام نہ کرے، کوئی دوسروں کے غلط خیالات کو اپنے لئے رکاوٹ سمجھتا ہے کوئی دفتروں اور پابندیوں کی ایک فہرست لئے بیٹھا ہے، کسی کو ایک ایسا فقہی اور قانونی پیاناں لگ گیا ہے جس سے پانپے میں اس کا جامہ باطل درست اترتا ہے، کسی نے احمادیت کے ذریعے میں سے اپنے مناسب حال چند موزوں حدیثوں کو چھانٹ لیا ہے جو اس کے طرز عمل کو صحیح ترین ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کے پاس اپنے غیر اسلامی رویے کی ایک اسلامی توجیہ اور اپنی آخرت فراموش زندگی کی ایک خالص دینی تاویل موجود ہے۔ اور اگر آپ ان نادبالات کی حقیقت کھول دیں تو موجودہ

دوسری شیطان نے چند ایسے الفاظ جمیا کر دیے ہیں جن کے ذریعہ کسی بھی طرح ترین تنقید کو نہایت آسانی سے روکا جاسکتا ہے۔
 — ”یہ شدت پسندی ہے۔“ ”یہ تعادلاں انتہا پسندانہ ذوق ہے۔“ ”تم کم مٹے نما زبیں سوچتے ہو۔“ ”تم اعتدال کے راستے سے ہٹ گئے ہو۔“ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ آپ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ کیوں کہ خدا کے رسول پہلے ہی اعلان فرماتے ہیں کہ اَللّٰہُ یُنْصِرُ!

مگر یاد رکھئے آج آپ ایک نامحکوم انسان کو ان جوابات سے خاموش کر سکتے ہیں۔ مگر خدا کے یہاں اس قسم کے جوابات ہرگز کافی نہ ہوں گے۔ وہاں تو آپ کی پوری زندگی کا بخیر ادھیڑ کر رکھ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تم خود دیکھ لو کہ دنیا کی زندگی میں تم جن مشغول میں مصروف تھے ان کے پیچھے کیا محرمات کام کر رہے تھے۔

میرے ایک ساتھی نے ایک مرتبہ بہت عمدہ بات کہی۔ ”آخرت میں خدا کا انعام اسی کو ملے گا جس نے دنیا میں خدا کے انعام کو پایا ہو۔ اس بات پر غور کیجئے تو اس میں نصیحت کے بہت سے پہلو چھپے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، آپ دین حق کے علم بردار ہیں، یہ دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ آپ خدا کی جنت کے امیدوار ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ انعام جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا، وہ محض دعویٰ اور خوش گمانیوں کے ذریعہ تو کسی کو ہمیں مل سکتا۔ یہ انعام صرف اس کے لئے ہے جس نے دنیا میں اپنی آخرت طلبی کو نمایاں طور پر ثابت کر دیا ہو، جس نے اپنے مسلسل رویے سے یہ دکھایا ہو کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں وہ اس کے پانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ جب دوسرے لوگ دنیا کی لذتوں میں کھوسے ہوئے تھے تو وہ خدا کے انعام کے تصور میں اتنا محو ہوا کہ اسے دنیا کی لذتیں بھول گئیں۔ جب دوسرے لوگ اپنے ذوق کو تسکین دینے میں مصروف تھے تو وہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا، جب دوسرے لوگ سوتے تھے تو وہ جاگتا تھا، جب دوسرے آرام کرتے تھے تو وہ تکلیف اٹھاتا تھا، جب دوسرے لوگ سنی اور تفریح میں دل بہلا رہے تھے تو وہ افسردہ رہتا تھا۔ مختصر یہ کہ جب دوسرے لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو گم کئے ہوئے تھے تو وہ آخرت کی زندگی کے لئے اپنا ایک ایک لمحہ صرف کر رہا تھا۔

جنت کا مستحق ہونا دوسرے لفظوں میں آخرت میں کسی کا ممتاز مقام حاصل کرنا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں صرف وہی شخص کسی ممتاز مقام کو پاتا ہے جس نے اس کے لئے بے پناہ جدوجہد کی ہو۔ ٹھیک اسی طرح آخرت کے درجات عالیہ بھی وہی لوگ پائیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو اس کے لئے کھپا دیا ہو۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اپنی سہمی زندگی کے نتیجے میں وہ آخرت کے انعامات کو حاصل کرے گا تو یہ محض خوش فہمی ہے۔ ٹھیک دسی ہی خوش فہمی جیسے کوئی شخص سمجھ لے کہ وہ بستر پر لیٹے لیٹے وہ مقام حاصل کر سکتا ہے جب کہ دنیا اسے ”فاتح یورپ“ کے نام سے پکارے اور اس کو وہ اعزازات نصیب ہوں جو ہلیری اور تین رنگ کو لمبی جدوجہد کے بعد حاصل ہوئے۔

۱۸۴۲ میں انجیلیڈ کے دیہات میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پیدائش کے وقت وہ اتنا کمزور تھا کہ دایوں نے اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی ظاہر کی۔ اس کا کمزور سر حفاظت کی خاطر چڑے کی پٹی سے لپیٹ دیا گیا۔ اس کے بعد جب وہ بڑا ہو کر بالی اسکول پہنچا تو وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے پیچھے تھا۔ مگر یہی کمزور لڑکا جب پچاس سال کی عمر میں مرا تو وہ نیوٹن کے

پر عظمت نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ نہ صرف انگلینڈ میں اس کو بلند ترین اعزازات حاصل ہوئے بلکہ ساری دنیا میں اپنی ذہنی عظمت کا اس نے ایسا سک بٹھایا کہ اس کے مرنے کے سو سال بعد جب دور بینی مطالعہ میں سائنس دانوں نے دیکھا کہ سیارہ یورے نس نیوٹن کے قانون تجاذب کے بتائے ہوئے راستے سے کچھ ہٹا ہوا ہے تو انھوں نے نیوٹن کے اصول کی فطری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کوئی اور سیارہ ہونا چاہئے جس کی کشش سے اس کی رفتار میں یہ فرق پیدا ہوا ہے۔

نیوٹن کو یہ عظمت کیوں کر حاصل ہوئی اس کا جواب خود اس کی زبان سے سنئے۔ ایک مرتبہ اس کے کارناموں کی تعریف کی گئی تو اس نے کہا:

"I had no special sagacity — only the power of patient thought"

یعنی میرے اندر کوئی خصوصی قابلیت نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ ملادہ صرف اس وجہ سے ملا کہ میں نے کائنات کو سمجھنے کے لئے انتہک جدوجہد سے کام لیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب (Principia) کی تیاری کے دوران میں اٹھارہ مہینے تک اس کا یہ حال تھا کہ وہ گھنٹوں بے حس و حرکت پڑا سوچتا رہتا۔ اس کے بعد یکایک اپنی ڈسک پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور گھنٹوں مسلسل ٹکھتا رہتا۔ اس کو اتنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا کہ قریب کی کسی کھینچ کر اس پر بیٹھ جائے۔ اس کے سرکشی کی رپورٹ ہے کہ اس دوران میں بہت کم ایسا ہوا کہ وہ دو بجے سے پہلے بستر پر گیا ہو اور بعض اوقات تو پانچ اور چھ بج جلتے تھے۔ لکنا بھی وہ اکثر بھول جاتا تھا۔ اس کی زندگی کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا کہ تم سگریٹ کیوں نہیں پیتے، اس نے جواب دیا:

"Because I do not want to acquire any new necessities".

یعنی میں سگریٹ اس لئے نہیں پیتا کہ اس کی وجہ سے میری ضروریات زندگی میں خواہ مخواہ ایک نئی ضرورت کا اضافہ ہو جائے گا۔ ولیم ہرشل William Harschell ایک جرمن سائنس دان گزرا ہے۔ اس نے فلکیات کے مطالعہ میں انسان کے علم کو بہت آگے بڑھایا۔ اس کا حال یہ تھا کہ معاشی تنگی کی وجہ سے اسکول کے بدوہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ایک ملازمت کرنی۔ لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے انیس سال کی عمر میں یہ ملازمت بھی چھوڑنی پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاندانی پیشے کو اختیار کیا اور وائلن بجانے لگا۔ اسی دوران میں اس کو فلکیات کے موضوع پر ایک کتاب ملی۔ اس کتاب کو اس نے بہت غور سے پڑھا۔ اس کے بعد ہرشل کو ستاروں کے مطالعہ سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس کا یہ شوق اتنا بڑھا کہ کبھی کبھی رات کے وقت جب اس کی ٹولی ساز و نمونہ مصروف ہوتی تھی وہ مجلس چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل جاتا تاکہ آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کی ایک جھلک دیکھ آئے۔

ستاروں کے مطالعہ کے لئے دور بین ضروری تھی۔ مگر اٹھارھویں صدی کا زمانہ تھا جب کہ دور بین ابھی جلد ہی ایجاد ہوئی تھی اور نہ صرف یہ کہ ناقص تھی بلکہ اس کا ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ ہرشل نے خود اپنی دور بین بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے متعلق فنی واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس نے ریاضی پڑھنی شروع کی اور لمبی محنت کے بعد خود اپنے ہاتھ سے دور بین

تیار کی۔ ظاہر ہے کہ اس کی پہلی دور بین ابھی بہت ناقص تھی۔ مگر وہ ہمت نہ ہارا۔ دور بین کو ترقی دینے اور اس کو بہتر بنانے میں اس کا انہماک اتنا بڑھا کہ اس کا پورا گھر دور بین کا ایک کارخانہ بن گیا۔ اس زمانے میں ہرشل کی مشغولیت کا یہ حال تھا کہ وہ کھانے کے لئے بھی اپنی درکشپ سے نہیں نکلتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بہن کو اکثر اس طرح اسے کھانے کے لئے آمادہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنے کام میں لگا رہتا اور بہن اس کے پیلوں میں کھڑی ہوئی اس کے منہ میں نمک ڈالتی جاتی۔

صاف ساقوں میں جب کہ آسمان پر بادل نہیں ہوتے تھے، بہت کم ایسا ہوتا کہ ہرشل بستر کے اوپر نظر کرتے۔ ایسی راتوں کا بہترین مصرف اس کے نزدیک یہ تھا کہ اس کو ستاروں کا مشاہدہ کرنے میں بسر کرے۔ اس کی انہیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس کو تاریخ میں وہ مقام حاصل ہوا جس کو ایک مصنف نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"... he had looked farther into space
than any other eye had yet seen"

یعنی اس نے کائنات میں اتنی دور تک دیکھا جتنا اس سے پہلے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا تھا۔

نومبر ۱۸ء کی ایک تاریخ کو جب ایک یورپین ڈاکٹر کے کمرے میں اس کا ملازم داخل ہوا تو ڈاکٹر اور اس کے دو ساتھی اچھی کرسیوں سے گڑ گڑش پر اندھے منہ بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ ملازم نے سمجھا کہ شاید ان لوگوں نے کوئی تیز قسم کی شراب پی لی ہے۔ اس نے ان کے کپڑے درست کئے اور خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ یہ وہ اہل جیمز سمکس اور اس کے دو اسٹنٹ تھے جنہوں نے پہلی بار کلوڈ فارم کے اثرات کا تجربہ کرنے کے لئے اس کو سانس کے ذریعہ اپنے اندر داخل کر لیا تھا۔ سمکس ایک دیہاتی نانبائی کے سات لڑکوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ چار سال کی عمر میں اس نے دیہات کے اسکول میں تعلیم شروع کی اور اس میں اتنی دل چسپی اور توجہ دکھائی کہ اس کا باپ اور چچا بھائی اس پر راضی ہو گئے کہ نہایت ضروری مصارف پر رقاعت کر کے اس کو اعلیٰ تعلیم کے لئے شہر بھیجیں۔ اس طرح وہ اڈنبرا یونیورسٹی پہنچا۔ اسی نانبائی کے لڑکے کے مراس بات کا سہرا ہے کہ اس نے آپریشن کے موقع پر کلوڈ فارم کا استعمال دریافت کر کے انسانیت کو ایک طویل اور جاگھا مصیبت سے نجات دی — اس نے انسان کو وہ چیز جس کو ڈاکٹر جان براؤن نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

"... one of God's best gifts to his suffering children."

یعنی دلہی انسانوں کے نام خدا کے تحفوں میں سے ایک بہترین تحفہ — مگر سمکس یہ تاریخی کام صرف اس وقت کر سکا جبکہ اس کی تحقیق میں اس نے اپنے آپ کو پوری طرح لگا دیا اور اس کے لئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

یہ ان لوگوں میں سے صرف چند کا ذکر ہے جنہوں نے دنیا میں عزت کا مقام حاصل کیا۔ آپ اس طرح کے بہت سے واقعات کو کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جنت دنیوی میں صرف وہ لوگ داخل ہو سکے جنہوں نے بے پناہ مشقت اٹھائی۔ جنہوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو اس کے پیچھے بھونک دیا۔ دنیا اپنی پشت پر پٹنے والے کروڑوں اور اربوں انسانوں میں سے صرف ان تھوڑے سے لوگوں کو عزت اور سر بلندی کا مقام دینے کے لئے منتخب کرتی ہے جو اس کے لئے اپنے آپ کو فدا کر دیتے ہیں، جو اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیتے ہیں پھر خدا کی جنت جو اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے، اس قدر

خام خیالی ہوگی اگر کوئی شخص سمجھ لے کہ محض سطحی قسم کے عمل کے ذریعہ وہ اسے حاصل کر لے گا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَذَلُّوا الْجَنَّةَ وَلَمْ يَأْتِ بِكُمْ مَثَلٌ
الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَكْبِرِينَ الْاَسَافُ وَالْاَضْرَافُ
وَزُلْزِلَتْ سَاحَتُهُمْ يَقُولُ الرَّاٰ سُوْلًا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهُ مَعٰی نَعْمَ اللّٰهُ اَلَا اِنَّ نَظَرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝

بقرہ ۲۱۴

اے گی۔ سہ لور ایسے لوگوں کے لئے اخلاکی مدد قریب ہے۔

آخر میں آپ کو میں ایک واقعہ سنا ناچاہتا ہوں جو پچھلے دس سال سے میری یادداشت کا بہترین حصہ رہا ہے یہ ایک انگریز مسٹر آرنلڈ کا واقعہ ہے جو علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۹۲ء میں جب مولانا شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا تو جہاز میں پورٹ سعید تک مسٹر آرنلڈ کا بھی ساتھ رہا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں:

”اگر میری صبح کو میں سوئے ہوتا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستگی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بے کار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس مخاطب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو خبر بھی ہے۔ بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں۔ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا موقع ہے۔ فرمایا کہ جہاز کو اگر بر باد ہی ہوتا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو رائیگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔“ سفر نامہ روم و مصر د شام صفحہ ۱۲

سمندر کی لہروں کے درمیان جہاز کی یہ غیر یقینی حالت آٹھ گھنٹے قائم رہی۔ آٹھ گھنٹے کا یہ وقت مسٹر آرنلڈ کے لئے جو حیثیت رکھتا تھا مومن کے لئے وہی حیثیت اس کی پوری زندگی کی ہے۔ آپ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا ہیں کہ جہاز آپ کی موت آجائے۔ ہر لمحہ آپ کے لئے زندگی کا آخری لمحہ ہے۔ اگر آدمی کو اس بات کا واقعی احساس ہو جائے تو وہ اسی طرح ہمہ تن مشغول نظر آئے گا جیسے امتحان میں بیٹھا ہوا وہ طالب علم جس کا وقت ختم ہو رہا ہو اور ابھی اسے کئی سوال کرنے باقی ہوں۔ لیکن اگر آپ غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے وقت کی اہمیت نہیں سمجھتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اس نادرک صورت حال کا احساس نہیں ہے جس میں آپ کی زندگی کا جہاز گھرا ہوا ہے۔ آپ موت سے نہیں ڈرتے آپ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ سوچئے کہ آپ کی زندگی آپ کے بارے میں کس چیز کا ثبوت دے رہی ہے (زندگی بے لاف) (۱۳۸۱)

اسلامک یوتھ آرگنائزیشن (رام پور) کے اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ۱۳ جولائی ۱۹۶۱

خدمت دین کی مشکلات

پندرہ سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ رواں نامی بستی کے باہر ایک باغ میں جماعت اسلامی کا مجلسی ماہانہ اجتماع ہو رہا تھا۔ ظہر کا وقت تھا۔ اذان ہو چکی تھی، ایک بڑے درخت کے نیچے فرش بچھا ہوا تھا جہاں کچھ لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے اور کچھ نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک حادثہ پیش آیا۔ اجتماع کے باطل قریب ایک بڑا سا گڑھا تھا جس کے عین کنارے سے راستہ گزرتا تھا۔ اس راستہ پر ایک بیل گاڑی جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ گڑھے کے کنارے پہنچی اس کا ایک طرف کا پیہر پھسل گیا اور پوری گاڑی کروٹ ہو کر گڑھے میں اس طرح گر گئی کہ ایک پیہر اوپر کھڑا تھا اور دوسرا نیچے دبا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم میں سے کچھ لوگوں کی نظر اس پر پڑی، وہ فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ گاڑی سامان سے لدی ہوئی تھی۔ بیل بھی اس کے ساتھ جوئے میں پھنسے ہوئے تھے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چند لوگ کیسے اس مسئلہ کو حل کر سکیں گے۔ مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، بلکہ فی الفور اقدام کرنے کا وقت تھا۔ آئے والے فوراً اپنے کام میں لگ گئے۔ کچھ نے نیچے سے زور لگایا اور کچھ نے اوپر سے پکڑ کر گاڑی کو اٹھانا شروع کیا۔ میں ان خوش نصیبوں میں تھا جو گاڑی کو نیچے سے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ بیک ایک ہم نے دیکھا کہ گاڑی اٹھا کر اوپر رکھ دی گئی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ جو چند آدمی اس کام میں لگے تھے ان سب کا متفقہ احساس تھا کہ گاڑی ہم نے نہیں اٹھائی ہے، بلکہ وہ تو کسی اور نے اٹھا کر کھڑی کر دی ہے۔ نیچے ہاتھ دینے والوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر سے کوئی اس کو کھینچنے چلا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ اوپر تھے ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا گاڑی نیچے سے اٹھتی چلی آ رہی ہے۔

یہ واقعہ جو پچھلے پندرہ سال سے میری یادداشت کا بہترین سرمایہ رہا ہے اس کو میں نے قصہ خوانی کے طور پر آپ کے سامنے پیش نہیں کیا ہے، خدا مجھ کو اس سے بچائے کہ میں قصہ خوانی کو اپنا طریقہ بناؤں اور قصے سنانے میں آپ کا وقت ضائع کروں۔ میں نے اس کو صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ اس پر غور کریں۔ کیوں کہ اس کے اندر ہمارے لئے بڑی عبرت کا سامان ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے اس بات کا پیغام ہے کہ خدا انسانوں کی مدد کرتا ہے، یہ ہمارے لئے خدا کی مدد کا ایک ذاتی تجربہ ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہم پڑھتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہماری اپنی زندگی میں پیش آیا ہے جس کا ہم نے براہ راست تجربہ کیا ہے۔ لدی ہوئی اور پھنسی ہوئی گاڑی کا محض چند آدمیوں کے ہاتھ لگانے سے دم بھر میں اٹھ کر کھڑی ہو جانا، یقیناً خدا کی مدد کی وجہ سے تھا۔ اگر ہم کو وہ آنکھیں حاصل ہوتیں جن سے غیر مادی حقیقتوں کو دیکھا جاسکے تو ہم دیکھتے کہ عین اس وقت جب کہ چند کمزور آدمی محض خدا کے بھروسے پر باطل حسبتہ خدا ایک نیک کام کے لئے دوڑ پڑے تو کسی وقت آسمان سے فرشتوں کی بھی ایک فوج اتر آئی اور اس نے آن کی آن میں وہ کام کر دیا جو ہمارے کم زور ہاتھوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔

دوستو! ای طرح سے ایک اور گاڑی پھنسی ہوئی ہے۔ یہ دین کی گاڑی ہے۔ اسلام کی گاڑی چلتے چلتے حالات

میں بھینس گئی ہے۔ پاسا فوں کی غفلت سے باطل اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ زمین کی خرابی سے اس کے پے اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ آپ اس کے لئے دوڑیں۔ آپ اس کو اٹھانے کے لئے اپنے وجود کو نکالیں۔ آپ کی زندگی کا بہترین مصروف، آپ کے اوقات کا اعلیٰ ترین استعمال اس وقت اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ خدا کے دین کی گاڑی کو اٹھائیں جس لئے ہوئے ہوں۔ اس زمین پر انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔ خدا کے دین کا نظام ہونا ہمارے لئے سعادت و کامرانی کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ اگرچہ دین اور اہل دین کے لئے انتہائی سخت حالت ہے، مگر انہیں سخت حالات میں ہمارے لئے اس سب سے بڑی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے جس کی اس دنیا میں کوئی شخص متناکر سکتا ہے۔ انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں کہ وہ خدا کے کام میں لگا ہوا ہو۔ ہمارا عاجز اور کمزور وجود خدا کی خدمت میں مصروف ہو۔ کیا اس سے بڑی بھی کوئی بات ہو سکتی ہے جس کی ہم آرزو کریں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا کی مدد کے لئے اٹھنا خود ہم کو خدا کی مدد کا مستحق بناتا ہے۔ جب بندہ خدا کے کام میں مصروف ہوتا ہے تو وہ تنہا نہیں ہوتا، بلکہ خود خدا بھی اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ خدمت دین وہ بہترین وقت ہے جب بندے کو خدا کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ لمحات کس قدر قیمتی ہیں جب بندہ خدا کے ساتھ چل رہا ہو، جب وہ خدا کے سایہ میں سفر کر رہا ہو، جب خدا کے فرشتے اس کے ہم رکاب ہوں، جب وہ براہ راست خدا کی نگرانی میں آگیا ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک معمولی آدمی کو اگر کسی حاکم کی معیت حاصل ہو جائے تو وہ پھولا نہیں سماتا۔ پھر خدا کی معیت اور اس کی مدد کا کیا ٹھکانا۔

دین آج جس چیز کا تقاضا کر رہا ہے، اسے آپ ہی کو پورا کرنا ہے۔ یہ کام آپ کو انجام دینا ہے۔ خدا کی طرف سے آپ کو ایمان کی توفیق ملنا اور آخری رسول کی امت میں شامل کیا جانا، گویا خدا کی طرف سے آپ کو اس کام پر مقرر کیا جانا ہے۔ آپ کا ایمان، اس کام پر آپ کے تقرر کا نشان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جاتا ہے تو اس کے لئے اس کی ڈیوٹی کے مطابق تمام انتظامات بھی کر دئے جاتے ہیں۔ ایک شخص کو حکومت کی طرف سے خطہ کے تمام کو فلاں جنگلی علاقے میں فارسٹ افسر بنایا گیا ہے، تم وہاں جا کر اپنی ڈیوٹی سمجھا لو۔ تو اس کے ذہن میں فوراً چند سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس وقت وہ سرکاری ملازمتوں کے تعلق حکومت کے شائع شدہ قواعد و ضوابط سے رجوع کرے تو وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے سارے سوالات کا پیشگی جواب لکھ دیا گیا ہے۔ ”گھر سے ڈیوٹی کے مقام تک جانے کی صورت کیا ہوگی؟“ جواب یہ کہ تم کو پوری مسافت کے لئے معقول سفر خرچ دیا جاتا ہے۔ ”میں وہاں جا کر کس جگہ رہوں گا؟“ اس کا جواب یہ ہوگا کہ وہاں تمہارے رہنے کے لئے سرکاری ہوٹل بنا ہوا ہے۔ ”جنگل میں اپنی حفاظت کے لئے میں کیا کر دوں گا؟“ حفاظتی دستہ تمہارے ساتھ موجود رہے گا۔ ”گھر کے اخراجات کے لئے کیا ہوگا؟“ تم کو ماہانہ تنخواہ کے طور پر ایک معقول رقم دی جائے گی۔ اس طرح لازم کے ہر سوال کا ایک اطمینان بخش جواب حکومت کے پاس موجود ہوگا۔ ہر تقرر لازماً یہ چاہتا ہے کہ جس کو مقرر کیا جائے، اس کی ضروریات اور مشکلات کا بھی اس میں پورا لحاظ کیا گیا ہو۔

اسی طرح خدا نے جب آپ کو ایک کام پر مقرر کیا ہے تو اسی کے ساتھ اس نے یقینی طور پر آپ کی ہر ضرورت کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ خدا تمام مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ اس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کا اقتدار ہے۔ ذرائع و وسائل کا

سارا خزانہ اس کی صفحتی میں ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عاجز اور حقیر بندوں کو ایک کام پر مقرر کرے اور پھر ان کی ضروریات کا لحاظ نہ کرے۔ یہ اس کی صفت و رحمت کے خلاف ہے۔ یہ اس کی شانِ اقتدار کے منافی ہے۔ بلاشبہ اس نے خادمانِ دین کی تمام ضروریات کا اس دنیا میں مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسا انتظام کہ آخرت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر دشواریوں اور مشکلوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔

یہ انتظام کیا ہے اور ہم کس طرح اسے جائز، اس کی میں نہایت آسان صورت آپ کو بتاؤں۔ آپ خدمتِ دین کے کام کا ارادہ کیجئے اور اس کے بعد سوچئے کہ اس کام میں آپ کی کیا کیا ضرورتیں ہو سکتی ہیں۔ جتنی معقول ضرورتیں اور حقیقی مسائل آپ کی سمجھ میں آئیں، ان سب کی ایک فہرست بنا ڈالئے اور اس کے بعد خدا کی کتاب کھول کر اس کو بتا دیا ہے پڑھتے شروع کیجئے۔ باطل اسی طرح جیسے ایک ملازم سرکار اپنی ملازمت کے مسائل کے متعلق جاننے کے لئے حکومت کے قواعد و ضوابط کا مطالعہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا کی کتاب آپ کے ہر معقول مطالبے کا قطعی اور قطعی جواب دیتی ہو، جی جی جاری ہے۔ کسی بھی ایسا حقیقی ضرورت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جس کا خدا کی کتاب ذمہ نہ لے رہی ہو۔ اس معاملہ میں ہرگز آپ کتاب الہی کو خاموش نہ پائیں گے۔ اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا کی کتاب میں ہماری کسی ضرورت کے بارے میں ایک یقین دہانی کا مل جاتا اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کریں۔ ایمان کا مطلب خدا پر توکل ہے اور ایمان کے لفظی معنی بھروسہ اور اعتبار ہی کے آتے ہیں (یوسف ۱۱) خدا پر اور قرآن پر ایمان لانے کا اصل مطلب یہی ہے۔ اس لئے اگر ہم خدا کی کتاب میں ایک یقین دہانی پالینے کے باوجود اس پر اعتماد نہ کریں تو یہ خود ہمارے ایمان کے خلاف ہو گا۔ ایسی صورت میں ہم کو خود اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہئے نہ کہ ہم قرآن کے الفاظ پر شبہ کریں۔

۱۔ آئیے ہم اس حیثیت سے قرآن کا ایک مختصر مطالعہ کریں۔ موجودہ زمانے میں دین کی خدمت کرنے کا ارادہ ہم سے کن ضرورتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک دائمی کے سامنے سب سے پہلا سوال جو آتا ہے وہ یہ ہے کہ بڑا مشکل کام ہے اور میں نہایت کمزور ہوں۔ خاص طور پر اس کے لئے زبانِ دقلم کی زبردست طاقت درکار ہے اور مجھے اس پر قدرت نہیں۔ اس کا آغاز زبانِ دقلم ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے اپنی بے مائیگی کا احساس اور حالات کی ناسمجدی کی وجہ سے بہت تہمتی — یہ دو چیزیں سب سے پہلے موجودہ زمانے میں دعوتی کام کی بات سوچنے والے پر طاری ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ دین میں رکھ کر جب ہم قرآن کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک مرد صالح کو اللہ تعالیٰ کو ہر طور پر بلا کر اس کو بیچری عطا کرتا ہے اور اس کو یہ خدمت سونپنا ہے کہ وہ فرعون اور مصر کی فطرتی قوم کے پاس جا کر اس کو خدا کا پیغام پہنچائے۔ حضرت موسیٰ محکومِ فقر سے تلقین رکھتے تھے اور ان کو ملک کی طرف ان قوم کو مخاطب کرنے کا کام سونپا جا رہا تھا۔ اس قدر کوس کر وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ خدایا میں اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پاتا ہوں اور میری زبان میرا ساتھ دیتی ہوئی نظر نہیں آتی :

رَبِّ اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یَّضِلَّکَیْ بَوْنٌ وَّ یَضِیْقَ صَدْرِیْ وَاَنْ یَّطْلُقَ لِیْسَافِیْ شَعْرَ ۱۲-۱۳
خدایا مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔

سارا خزانہ اس کی صفحی میں ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عاجز اور حقیر بندوں کو ایک کام پر مقرر کرے اور پھر ان کی ضروریات کا لحاظ نہ کرے۔ یہ اس کی صفت و رحیمیت کے خلاف ہے۔ یہ اس کی شان اقتدار کے منافی ہے۔ بلاشبہ اس نے خادمانِ دین کی تمام ضروریات کا اس دنیا میں مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسا انتظام کہ آخرت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر دشواریوں اور مشکلات کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔

یہ انتظام کیا ہے اور ہم کس طرح اسے جانیں، اس کی میں نہایت آسان صورت آپ کو بتاؤں۔ آپ خدمتِ دین کے کام کا ارادہ کیجئے اور اس کے بعد سوچئے کہ اس کام میں آپ کی کیا کیا ضرورتیں ہو سکتی ہیں۔ جتنی معقول ضرورتیں اور فاقی مسائل آپ کی سمجھ میں آئیں، ان سب کی ایک فہرست بنائے اور اس کے بعد خدا کی کتاب کھول کر اس کو بتا دے پڑھتے شروع کیجئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ملازم سرکار اپنی ملازمت کے مسائل کے متعلق جاننے کے لئے حکومت کے قواعد و ضوابط کا مطالعہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو نظرائے گاہِ خدا کی کتاب آپ کے ہر معقول مطالبے کا قطعی اور یقینی جواب دیتے ہوئے جاری رہے گی۔ کسی بھی ایسی حقیقی ضرورت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جس کا خدا کی کتاب ذمہ نہ لے رہی ہو۔ اس معاملہ میں ہرگز آپ کتاب الہی کو خاموش نہ پائیں گے۔ اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا کی کتاب میں ہماری کسی ضرورت کے بارے میں ایک یقین دہانی کا مل جانا اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کریں۔ ایمان کا مطلب خدا پر توکل ہے اور ایمان کے لفظی معنی بھروسہ اور اعتبار ہی کے آتے ہیں (یوسف ۱۱) خدایا اور قرآن پر ایمان لانے کا اصل مطلب یہ ہے۔ اس لئے اگر ہم خدا کی کتاب میں ایک یقین دہانی پالنے کے باوجود اس پر اعتماد نہ کریں تو یہ خود بارے ایمان کے خلاف ہو گا۔ ایسی صورت میں ہم کو خود اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہئے نہ کہ ہم قرآن کے الفاظ پر شبہ کریں۔

۱۔ آئیے ہم اس حیثیت سے قرآن کا ایک مختصر مطالعہ کریں۔ موجودہ زمانے میں دین کی خدمت کرنے کا ارادہ ہم سے کن ضرورتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک دائمی کے سامنے سب سے پہلا سوال جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ پڑا مشکل کام ہے اور میں نہایت کمزور ہوں۔ خاص طور پر اس کے لئے زبان و قلم کی زبردست طاقت درکار ہے اور مجھے اس پر قدرت نہیں۔ اس کا آغاز زبان و قلم ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے اپنی بے مائیگی کا احساس اور حالات کی ناسمجدی کی وجہ سے پست جہتی — یہ دو چیزیں سب سے پہلے موجودہ زمانے میں دعوتِ کام کی بات سوچنے والے پر طاری ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ ذہن میں رکھ کر جب ہم قرآن کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک مرد صالح کو اللہ تعالیٰ کو پوچھ پچا کر اس کو پیغمبری عطا کرتا ہے اور اس کو یہ خدمت پہنچا ہے کہ وہ فرعون اور مصر کی فحش قوم کے پاس جا کر اس کو خدا کا پیغام پہنچائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فریقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو ملک کی حکمران قوم کو خطاب کرنے کا کام سونپا جا رہا تھا۔ اس قدر کہ سن کر وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ خدایا میں اپنے اندر اس کی جہت نہیں پا رہا ہوں اور میری زبان میرا ساتھ دیتی ہوئی نظر نہیں آتی :

رَبِّ اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یَّکُوْنَنَّ بُوْدُنْ کَوْیْقُیْتُ صَدْ رِیْ وَلَا
 یُطْلِقَنَّ لِیْسَافِیْ شَعْرَہ ۱۲-۱۳ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان نہیں ہلتی۔

خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ تم ڈر مت۔ تمہاری ضرورت کی سب چیزیں تم کو ہماری طرف سے دے دی گئیں۔
 قَدْ اُوْتِیْتُمْ سُوْا لَکَ یَا مُوْسٰی (طہ - ۳۶)

یہ مانگے اور دئے جانے کا واقعہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، وہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک واقعہ کی شکل میں ہماری اسی قسم کی مانگ کا جواب ہے۔ امت محمدیہ کے افراد جو ختم نبوت کے بعد نبوت کے کام پر مامور کئے گئے ہیں ان کے لئے بنی اسرائیل کے پیغمبر کا یہ واقعہ ایک پیشگی بشارت ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اگر تم ہمارے دین کی دعوت دینے کے لئے اٹھو تو ہم تم کو زبان دیں گے جس سے تم بولو گے، اور ہم تمہاری ڈھارس بندھائیں گے۔ جس کے بعد تم بڑے بڑے مواقع پر کسی چپکچاہٹ کے بغیر ہماری آواز پہنچا سکو گے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر آج کسی بندہ خدا کے اندر حقیقتہً دہائی بننے کا جذبہ ابھرائے اور وہ بے تابانہ اپنے رب کو پکارا ٹھے کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں مگر:

اللہم یضیق صدری ولا یطلق لسانی
 خدا میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چپتی نہیں
 توفیقاً کلام الہی اس کو دوبارہ آواز دے کر کہے گا کہ جاؤ ہم نے تم کو وہ چیز دے دی جس کی تمہیں ضرورت تھی۔ وہی خدا آج بھی اس دنیا کا خدا ہے جس نے کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو خطاب کیا تھا۔ وہ آج بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو اس نے ہزاروں برس پہلے اپنے ایک بندے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ چاہے تو گوشت کو ناطق بنا دے اور بولتے ہوئے شخص کو گونگا کر دے۔ کم زور دل کو بہت دے دے اور بہت دالے کو پست کر کے بٹھا دے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہ اس کے اوپر بھروسہ کریں۔

۲۔ دوسری ضرورت جس کا اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے، وہ معاش کا مسئلہ ہے۔ آدمی جب دین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی اپنی ضروریات تو ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس کے جسمانی تقاضے، اس کا گھر، اس کا خاندان، اس سے بہت سی چیزیں مانگتے ہیں۔ اگر وہ دین کے کام کی طرف تھکے تو ذاتی کاموں میں کمی ہوتی ہے اور ذاتی ضروریات میں اپنی توجہ صرف کرے تو دین کا خانہ خالی رہ جاتا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے جو ہر داعی کے سامنے لانا پیش آتا ہے اور اس کو پریشان کرتا ہے۔

یہ سوال لے کر ہم قرآن پڑھنا شروع کرتے ہیں تو سب سے مقامات ہم کو ملتے ہیں جہاں اس معاملہ میں ہم کو خدا کی مدد کا یقین دلایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم قرآن کی ۹۵ ویں سورہ میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لِّہٖ مَخْرَجًا وَیَرْزُقْہٖ مِنْ
 جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ اس کے لئے نکل دے گی پیدا
 کر دے گا اور اس کو ایسی ایسی جگہوں سے رزق پہنچائے گا جہاں
 حِیْثَ لَا یَحْسَبُ

(طلاق ۲) اس کا گمان بھی نہیں جاسکتا۔

یہ ایک بہت بڑی یقینی دہائی ہے، یہ ایک عظیم انشورس ہے جو خدا کی طرف سے اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔ آج کا انسان سمجھتا ہے کہ صرف اس کا کھیت، اس کی دکان اور اس کی ملازمت واحد ذریعہ ہیں جو کسی کو رزق کر دیتے ہیں۔ اس کو خدا کے عظیم سرچشمے کی سرے سے خبر ہی نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں ایک اور خزانہ ہے جو تمام معلوم خزانوں سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ یہاں ایک

42

در اصل یہ ہے کہ وہ حالات کو اس طرح ہمارے موافق بنا دے گا کہ ہم باسانی اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ وہ ایسے امکانات پیدا کرے گا جن کو استعمال کر کے ہم اپنی کار بر آری کر سکتے ہوں، وہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے متعلق ایسے خیالات ڈالے گا کہ وہ ہمارے کام آسکیں، وہ ہمارے ذہن کو ایسی تدبیروں کی طرف لے جائے گا، جس کے بعد مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ وہ ایمان کی برکت سے ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو ایسی جلا دے گا کہ کم صلاحیت والے بہتر صلاحیت والوں سے زیادہ کام کر سکیں گے، مقابلے کے وقت وہ ہمارے دل کو مضبوط کرے گا اور دشمن کو مرعوب کر کے شکست کو آسان بنا دے گا۔ مختصر یہ کہ ہمارے کام بھی انھیں ظاہری حالات کے اندر ہوں گے جیسے سب کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایمان کی برکت اور اللہ تعالیٰ کی توجہ کی بنا پر حالات میں کچھ ایسا غیر معمولی پن آجائے گا کہ کثیر وسائل سے ہم زیادہ کام لے سکیں گے اور معمولی ساز و سامان کے باوجود زیادہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دوستو! یہ باتیں جو میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہیں، یہ کوئی جذباتی غور نہیں ہے اور نہ شاعری ہے۔ یہ ایک سراپا حقیقت کا اظہار ہے۔ اگر اس دنیا میں کوئی چیز ممکن ہے تو سب سے بڑا ممکن یہ ہے کہ بندہ جب خدا کی مدد کا محتاج ہو تو خدا اس کی مدد کرے۔ اس زمین و آسمان میں ہر دوسرے امکان کے بارے میں مجھے شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ امکان میرے لئے ہر شبہ اور تردد سے بالاتر ہے کہ خدا اپنے ان بندوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بندے کے اندر کوئی ذاتی طاقت ہے بعض مذاہب کی طرح میں اس نظریے پر کوئی عقیدہ نہیں رکھتا کہ انسان اپنی ریاضت سے خدا کو یا فطرت کی برتر طاقتوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل مغربا ہے۔ خدا کی مدد کو میں سب سے زیادہ قطعی اس لئے قرار دے رہا ہوں کہ یہ خدا کی اپنی صفت ہے۔ خدا کا رحیم اور قادر ہونا، اس کا خالق اور مالک ہونا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے عاجز اور محتاج بندوں کی مدد کرے۔ یاد رکھئے کہ یہ خدا کی شانِ خدائی کے بالکل خلاف ہے کہ وہ بندوں کو عاجز و مجبور کی حیثیت سے پیدا کرے۔ اور جب بندوں کا بجز کسی ضرورت کا محتاج ہو تو وہ ان کی مدد نہ فرمائے۔ یہ خدا کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ قطعاً ناممکن ہے۔

دوستو! اگر آپ کے پاس سننے کے لئے کان ہوں تو خدا کی کتاب پکار رہی ہے۔ من انصادی الی اللہ (کوئی ہے جو خدا کے کام میں اس کا مددگار بنے) اور اسی کے ساتھ اس میں یہ ضمانت بھی موجود ہے کہ — ان تصدق اللہ (منصکم) اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا) خدا آپ کو ایسے کام کے لئے پکار رہا ہے جس میں وہ خود آپ کا مددگار ہے۔ دین کی خدمت خدا کی صیت کا راستہ ہے۔ اس کی مدد سے ہم کنار ہونے کا راستہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو آپ کو جنت کی طرف لے جاتا ہے، اگر ایک ایسے کام کے لئے بھی آپ نہیں اٹھیں گے تو اگر کس کام کے لئے اٹھیں گے۔ اور اس خدمت کے بغیر مر گئے تو خدا کا سامنا کس طرح کریں گے۔

اٹھئے کہ اس سے بڑا کوئی کام نہیں، اٹھئے کہ اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہو سکتی (الفرقان ریح الثانی ۱۳۸۳ء)

جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے اجتماع میں کی گئی ایک تقریر، اداں ۱۹۶۳

ہمیں کیا کرنا ہے

”ہمیں کیا کرنا ہے“ — اس سوال کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو اور دوسرے بندگانِ خدا کو آگ کے عذاب سے بچانا ہے۔ قرآن نے زندگی کا جو تصور دیا ہے اس کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی گرفت سے بچ سکے۔ اس آئے دالے دن کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچانا اور دوسرے انسانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کرنا — یہی مسلمان کا اصل کام ہے اور اس کے سارے اعمال کا مرکز و محور یہی ایک چیز ہے۔

ہمارے ملک میں جو سب سے بڑا حادثہ پیش آرہا ہے وہ یہ کہ یہاں بسنے والے انسانوں میں سے ہر روز نقصانِ بڑا ڈھلا لکھ آدمی مر جاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کے فرشتے کل کے لئے جن ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں اس میں ہمارے ملک کے باشندوں میں سے کس کا نام ہو۔ ہم میں سے ہر شخص کو موت آتی ہے، مگر ہم میں سے کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی اور جن لوگوں کے درمیان ہم زندگی گزار رہے ہیں ان کے متعلق بھی کچھ نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کل اٹھایا جائے گا اور کون کل کے بعد ہمارا پیغام سننے کے لئے باقی رہے گا۔

ایک طرف یہ حقیقت ہے اور دوسری طرف یہ واقعہ کہ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ہماری اصل زندگی کا آغاز ہے۔ موت دراصل کسی انسان کا وہ وقت ہے جب وہ کائنات کی عدالت میں آخری فیصلے کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اب اگر آپ ان دونوں چیزوں کو ملا دیں، یعنی زندگی کی بے اعتباری اور یہ کہ زندگی کا اصل مسئلہ کیا ہے، تو فوراً آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ موت سے پہلے آدمی کو بہت سے کام نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آدمی کے سامنے ایک ہی کام ہوگا۔ وہ یہ کہ خدا کے غضب سے وہ کس طرح بچے۔ جب آدمی کے پاس بہت زیادہ وقت ہو تو وہ بہت سے کام چھیڑ دیتا ہے مگر جس کو وقت کے صرف چند لمحے حاصل ہوں وہ صرف وہی کام کرتا ہے جو انتہائی ضروری ہے فیصلہ کن لمحات میں کوئی شخص غیر متعلق کام میں مصروف ہونے کی حماقت نہیں کر سکتا۔

یہ آنے والا وقت ہم میں سے ہر شخص کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ ہر زندہ انسان اس خطرے میں مبتلا ہے کہ کل اس کی موت آجائے اور اس کے بعد نہ اس کے لئے سننے کا موقع باقی رہے اور نہ ہمارے لئے سنانے کا یہ صورت حال خود تباہی ہے کہ آپ کے کرنے کا کام کیا ہے۔ آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اس ملک کے ایک ایک شخص تک پہنچیں اور اس کو زندگی کے حقیقی مسئلہ سے آگاہ کریں۔ اس ملک کی آبادی اگر ساڑھ کر درہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو ساڑھ کروڑ کام کرنے ہیں۔ کیوں کہ آج کا ہر انسان حقیقت سے غافل ہے۔ ہر آدمی اس بات کا حاجت مند ہے کہ اس کو حقیقت کا علم پہنچایا جائے۔ ہمارے رہنما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دعوتِ حق کے کام پر مامور کیا گیا تو آپ نے مکہ میں ایک تقریر کی۔ نئی کی

جیت سے یہ آپ کی پہلی تقریر تھی۔ حمد و ثناء کے بعد آپ نے فرمایا:
 اِنَّ السَّائِلِ اِنْ لَا يَكُنْ بِاَهْلِكَ وَ اَللّٰهُ فَاَكُنْ بِاَهْلِكَ
 جبکہ اے مائیکہ! بتلاؤ کہ وہ خدا کی قسم اگر میں تمام لوگوں سے جھوٹ کہہ سکتا جب بھی تم سے جھوٹ نہ کہتا اور

عَدْرَتِكُمْ كَاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِلَىٰ لِرَسُولِ اللَّهِ
إِلَيْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاللَّهُ لَعَلَّكُمْ كُنَّا
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَلَتُبْعَثَنَّ كَمَا تَشْتَقُّ قُلُوبُكَ وَلَتَحَاسِبُنَّ بِمَا
تَعْمَلُونَ وَلَتُخْزَوْنَ بِالْحِسَابِ احْسَانًا وَرَبَّاسْتَوْء
مَوْءَاذِ إِنَّمَا لَاجِنَةُ الْإِنْدَاءِ أَوْ كُنَّا ذَا كُنْدًا
(حجۃ خطب العرب، حصہ اول، صفحہ ۵۱)

اگر میں تمام لوگوں کو دھوکا دے سکتا جب بھی تمہیں دھوکا نہ
دیتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی خدا نہیں، میں خدا کی طرف
سے بھیجا ہوا رسول ہوں تمہاری طرف خاص طور پر اور دوسرے
انسانوں کی طرف عام طور پر۔ خدا کی قسم تمہیں مرنا ہے جس طرح
تم سوتے ہو اور بھر تمہیں اٹھنا ہے جس طرح تم جاگتے ہو۔ اور
یقیناً تم سے تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ پھر اچھے عمل
کا اچھا بدلہ ملے گا اور برے عمل کا برا بدلہ۔ اس کے بعد یا تو
ہمیشہ کے لئے جنت ہے، یا ہمیشہ کے لئے آگ۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: اَنَا لَتَنِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ (میں میرا کام تم کو آخرت کے عذاب
سے ڈرانا ہے جس طرح "نذیرِ عالم") اپنے قبیلے کو آنے والے خطرے سے ہوشیار کرتا ہے۔ اسی لئے نبی کو قرآن میں "نذیرِ
بشر" کہا گیا ہے۔ یعنی وہ مستقبل کے خطرے سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے اور جو لوگ اس کے مطابق اپنے کو بنالیں ان کو
اس بات کی خوش خبری دیتا ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے۔ اور اسی لئے امت مسلمہ کا مقصد "شہادتِ حق" بتایا گیا ہے۔
یعنی لوگوں کے سامنے اس بات کو واضح کرنا کہ حق کیا ہے اور خدا کے یہاں ان کی نجات کا دار و مدار کس چیز پر ہے۔
یہ خدا کی طرف بلانا اور آنے والے دن سے ہوشیار کرنے کے لئے نذیرِ عربیاں بن جانا وہ سب سے بڑا انفرادی
پروردگار ہے جس سے اب تک انسان واقف ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑے کسی عملی پروگرام کا تصور نہیں کیا
جاسکتا۔ دوسرے پروردگار جو دنیا میں اختیار کئے جاتے ہیں وہ اپنے الفاظ اور غفلت کے لحاظ سے بہت بڑے بڑے
معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کے سب نہایت حقیر اور محدود ہیں۔ ان کا دائرہ انسانی زندگی میں تھوڑی
تھوڑی دور جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ نظریہ انسان کے اندر آخری حد تک سرایت کرتا ہے، یہ فساد کیر کے
خلاف جہادِ عظیم ہے جو دائمی کو سر تا پا مہم دہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ اس کے تمام ظاہری و باطنی معاملات میں انقلاب
برپا کرنے والا ہے۔ یہ کام اپنی ابتدا میں ایک کام ہے مگر جب وہ عمل میں آتا ہے تو شاخ در شاخ پھیلتا ہوا ہزار کام
بن جاتا ہے۔

جو لوگ صرف اقتدار کے لئے اٹھتے ہیں ان کا کام اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ ایک حاکم خاندان کو تخت
کریں یا چند سیاسی لیڈروں کو زیر کر کے ان سے حکومت کی کرسی چھین لیں۔ جب کہ یہ نظریہ ان تمام انسانوں کو فتح
کرتا چاہتا ہے جو زمین کے اوپر چل پھر رہے ہیں۔ سماجی اصلاح کا پروگرام چند اسکول اور چند ہسپتال بنوانے کے
بعد مطمئن ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا کام ہو گیا، جب کہ یہ نظریہ دلوں اور دماغوں کو بدل کر نئے قسم کے انسان دہلی
میں لانا چاہتا ہے جس سے زیادہ مشکل کوئی کام اس سرزمین کے اوپر نہیں ہے۔ معاشی اسکیمیں چند سال کی دنیوی زندگی
کے لئے کچھ نشانے آدمی کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ جب کہ یہ نظریہ لامتناہی زندگی کی بے حساب کامرانیوں حاصل کرنے

کے لئے آدمی کو متحرک کرتا ہے۔ ہر دوسرے کام کا ایک خاص میدان ہے۔ یہ میدان جہاں موجود نہ ہو وہاں اس کے کارکن بے دست و پا نظر آتے لگتے ہیں مثلاً اکثریت ایسے ماحول میں اپنے آپ کو بے بس پاتی ہے جہاں مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان جھگڑے نہ ہوں۔ آزادی کی تحریک کے لئے اس وقت کرنے کا کام کچھ نہیں رہتا جب بیرونی آفتا ہٹ گئے ہوں اور ان کی جگہ ملکی آقاؤں نے لے لی ہو۔ مگر یہ نظریہ ایک ایسا وسیع اور ہمہ گیر نظریہ ہے جس کے لئے ہر وقت کرنے کا کام ہے اور ہر جگہ اس کے لئے کام کا میدان موجود ہے۔

پھر اس نظریے کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ سب سے پہلے خود دوائی کو بدل دیتا ہے، جب کہ دوسرے نظریات کا حال یہ ہے کہ وہ صرف دوسروں سے تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں، خود اپنے بیرونیوں کے اندر تبدیلی لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک تحریک کچھ انسانوں کو جمع کرتی ہے تاکہ وہ خدائی قلت کے خلاف حکومت سے احتجاج کریں۔ مگر یہ افراد بجلی کے کھمبے توڑنا شروع کر دیتے ہیں، دکانوں کو لوٹتے ہیں، فٹے کے گوداموں میں آگ لگا دیتے ہیں، ریلوں اور سبوں کو چلنے سے روک دیتے ہیں۔ اس طرح ایک چیز کی قلت دوسروں کے لئے وہ بے شمار قلتیں ملک میں پیدا کر دیتے ہیں اور ساری زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ دوسروں کی جس برائی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں خود اسی میں لت پت ہوئے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ”آئے دالے دن“ کی گواہی دینے کے لئے جو لوگ اٹھتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کام کا آغاز خود اپنی ذات سے کرتے ہیں۔ وہ کچھ کہتے ہیں سب سے پہلے خود اس پر عمل کرتے ہیں۔ تمام اصلاحی سیکیں یہاں پہنچ کر ناکام ہو جاتی ہیں کہ اپنے پروگرام کے نفاذ کے لئے جن انسانوں سے انھیں کام لینا ہے وہ خلوص اور بے غرضی کے ساتھ ان کو نافذ کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انقلابی سیکیں کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر اپنے مخالف سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ بادشاہوں کے اقتدار کے خلاف اٹھنے والی تحریکیں سی ای لیڈروں کے اقتدار پر آشوب ہو جاتی ہیں۔ نجی مالکوں کی سرمایہ داری سے بنیاد ت کرنے والے دولت اور زمین کو اشتراکی متولیوں کے حوالے کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ نظریہ وہ واحد نظریہ ہے جو انسان کے اندر حقیقی تبدیلی پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے عقیدہ کو عمل بنائے اور ساری زندگی اس پر عمل کرتا رہے۔

دوسرے نظریات عام طور پر صرف تنقید کا جذبہ ابھارتے ہیں، جب کہ ”آئے دالے دن“ کا تصور عمل کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس نظریہ پر ایمان لانے کے بعد آدمی مجبور ہوتا ہے کہ سب سے پہلے خود عمل کرے جب کہ دوسرے نظریات صرف دوسروں سے عمل کا تقاضا کرتے ہیں، ان کے اندر ایسا کوئی محرک نہیں ہوتا جو دماغی کو خود عمل کرنے پر ابھارتا ہو۔ مگر جس شخص کو اس حقیقت نے متحرک کیا ہو کہ موجودہ زندگی امتحان کی زندگی ہے، ہم آزاد نہیں ہیں کہ جو چاہیں کرتے رہیں۔ بلکہ ہمارے تمام کھلے اور چھپے اعمال کا ایک روز حساب لیا جائے والا ہے۔ ایسا شخص عین اپنے ایمان کے تقاضے سے مجبور ہوتا ہے کہ اپنی پوری زندگی کو درست کرے۔ اپنے آپ کو آخری حد تک مقصد کی خدمت میں لگا دے۔ دوسروں کو بدلنے کی دعوت دینے کے ساتھ خود بھی اپنے آپ کو بدل ڈالے۔ کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنی کامیابی کا تصور نہیں کر سکتا۔ صرف دوسروں کی تبدیلی اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس کی نجات تو اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ

وہ خود بھی اپنے آپ کو بدل چکا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظریہ — دعوت اور تربیت — دونوں کو ایک کر دیتا ہے۔ اس نظریہ کا آدمی جب دوسروں کو پکارتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو مخاطب کر رہا ہوتا ہے اور جب وہ اپنے آپ کو مخاطب بناتا ہے تو اسی وقت اس کا تعلق دوسروں سے ہو جاتا ہے۔

اس نظریہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کارکن کو کبھی جو دمیں مبتلا نہیں کرتا اور نہ اسے مایوس ہونے دیتا۔ جو شخص اس مقصد کے لئے اٹھتا ہے اس کے سامنے بنیادی طور پر جو چیز ہوتی ہے وہ آخرت ہے۔ وہ اس لئے عمل کرتا ہے تاکہ اپنی بعد کی زندگی کو بہتر بنائے، تاکہ آخرت میں خدا کی گرفت سے بچ سکے۔ یہ چیز اس کو نفع نقصان اور کامیابی و ناکامی کے دنیوی تصور سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ وہ نیچے کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنا کام صرف یہ سمجھتا ہے کہ کوشش کرتا رہے اور اسی کوشش میں اپنی جان دے دے۔ اس کی انتہائی مناسبت یہ ہوتی ہے کہ فرشتے جب اس کی رپورٹ لے کر خدا کے پاس جاتی تو اس سے عرض کریں کہ خدا تیرا بندہ تیرے حکم کی تعمیل میں سرگرم ہے۔ ایک شخص کو بی۔ اے کرنے کے بعد روزگار نہ ملے تو وہ خود کشتی کر لیتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک صرف تعلیم حاصل کرنا کامیابی نہیں ہے بلکہ تعلیم کے دنیوی فوائد کو حاصل کرنے کا نام کامیابی ہے۔ ایک سیاسی لیڈر کو اپنے مشن میں کامیابی نہ ہو تو وہ سیاست کا کام چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے اور اپنی ناکامی کے احساس کو مختلف قسم کے مشغلوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک فوجی دینا کے مسائل کو دیکھتا ہے، اس کے اندر جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ان کو حل کرے، اس جذبے کے تحت وہ دنیا کی تعمیر کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر چند سال بعد جب خود اپنی زندگی کے مسائل اسے گھیرتے ہیں اور اس سے بیکار کا مطالعہ کرتے ہیں تو مسائل عالم کی اصلاح کا پروگرام اسے بھول جاتا ہے اور وہ اپنا گھر بنانے اور اپنے ذاتی مسائل کو حل کرنے میں لگ جاتا ہے۔ مگر جو شخص اللہ کے بندوں کو خدا کی طرف بلانے کے لئے اٹھتا ہو اس کے لئے ٹھہرنے اور مایوس ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ کیوں کہ اس کا راستہ دنیا میں کہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ سیدھا آخرت تک جاتا ہے۔ وہ پہلے دن سے جانتا ہے کہ اس نے جس منزل کی طرف اپنا سفر شروع کیا ہے وہ اس وقت آتی ہے جب زندگی کی گاڑی اپنے آخری اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ وہ آخر وقت تک لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف پکارتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسی حال میں اپنے رب سے جانتا ہے۔ یوں کہ نزدیک کامیابی یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے رب کی رضا کے لئے کام کرتا رہے، جب کہ دوسروں کے نزدیک کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی کوشش کے نتیجے کو پالیں۔

حاشیہ: مہرانی سفر میں قافلہ بار بار منزل کرتے ہوئے چلتے ہیں چنانچہ دہلیا ہمسفر میں کسی جو شہر اور قال احمد آبادی کو تیز رفتار سوار کی ذریعہ لگے گی یا جاتا ہے تاکہ وہ مطمئن کرے آئے کہ اگلی منزلوں میں قافلہ کو تعمیرانے کی منزلوں تک کون سی جگہ سے جو شخص اس کام کے لئے بھیجا جاتا ہے اسکو مائدہ کچھتے ہیں۔
 مہ عرب کی زندگی میں جب کوئی شخص دیکھتا کہ دشمن اس کی قوم کے سر پر آلیا ہے اور اس کو ذور موتا کہ اب وہ کہہ کر دے گا تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ دیتا اور منگتا ہو کر پناہ شروع کرتا کہ دشمن آگیا دشمن آگیا "ایسے شخص کو "ذہر عرباں" کہا جاتا تھا۔ یعنی منگتا ہو کر پناہ مانگنے والا۔

نوٹ: یہ تحریر ماہنامہ زندگی رام پور (شوال۔ ذی قعدہ ۱۳۷۹) میں ادارہ کے طور پر شائع ہوئی۔

مصنف کی تحریریں مسلسل پڑھنے کے لئے

ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ کیجئے

اسلام کی فطری دعوت اور اس کے ابدی
پیغام کو جدید اسلوب میں سمجھنے کے لئے
الرسالہ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ہے

سالانہ زرقاؤن ۴۸ روپے

الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ولیٹ ، نئی دہلی ۱۱

مصنف کی دوسری تصنیفات

امکانات جدیدۃ للدعوة
الشريعة الاسلامیة وتحديات العصر
للمسلمون بين الماضي والحال والمستقبل
فحوبعت اسلامي
وجوب تطبيق الشريعة الاسلامیة
العلم على خطی الدين
لابد من الثورة الفكریة
قبل الثورة التشريعیة
القرآن فی مواجهة التحديات المعصریة

ہندی مطبوعات

انسان اپنے آپ کو پہچان

منزل کی اور

نوٹیک کے پریش دوار پر

سپانی کی کموج

انگریزی مطبوعات

Muhammad:
The Prophet of Revolution
God Arises
Man! Know Thyself
Muhammad:
The Ideal Character
The Way to Find God
The Teachings of Islam
The Good Life
The Garden of Paradise
The Fire of Hell
Tabligh Movement
Islam in Harmony with
Human Nature
The Final Destination
No End to Possibilities
The Achievement of
Islamic Revolution
Religion and Science
The Prophet and his
Companions

اسلام پندرھویں صدی میں

راہیں بند نہیں

ایمانی طاقت

انتجا و ملت

سبق آموز واقعات

زلزلہ قیامت

حقیقت کی تلاش

پیغمبر اسلام

آخری سفر

تعارف اسلام

تعلیمات اسلام

اسلامی دعوت

خدا اور انسان

حل یہاں ہے

سچا راستہ

دین تعلیم

حیات طیبہ

باغ جنت

نارِ جہنم

دین کی سیاسی تعبیر

عربی مطبوعات

الاسلام يتحدی

الدين فی مواجهة العلم

حکمة الدين

الاسلام والعصر الحديث

مسئوليات الدعوة

نحو تدوين جديد للعلوم الاسلامیة

اردو مطبوعات

اللہ اکبر

تذکیر القرآن

الاسلام

عظمت قرآن

مذہب اور ہدیر حیلینج

ظہور اسلام

اجیار اسلام

پیغمبر انقلاب

سوشلزم اور اسلام

صراطِ مستقیم

اسلامی زندگی

اسلام اور عصر حاضر

راہِ حیات

حقیقت حج

خاتون اسلام

تعبیر کی غلطی

تبلیغی تحریک

دین کیسے ہے

قرآن کا مطلوب انسان

تجدید دین

اسلام دینِ فطرت

تعبیر ملت

تاریخ کا سبق

مذہب اور سائنس

عقائد اسلام

فادات کا مسئلہ

انسان اپنے آپ کو پہچان